هٰذا بلاغ للناس
دار العلوم کراچی کا ترجمان

جلد ۲۰ — ذیقعدہ ۱۴۰۶ھ / جولائی، اگست ۱۹۸۶ء — شمارہ ۱۱

* نگراں:
حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی

* مدیر:
محمد تقی عثمانی

* ناظم:
فاروق القاسمی ایم اے (عثمانیہ)

سالانہ بدل اشتراک: بیرون ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک و رجسٹری

ریاست ہائے متحدہ امریکہ ● برطانیہ ـ جنوبی افریقہ ـ ویسٹ انڈیز ـ برما ـ انڈیا ـ بنگلہ دیش ـ تھائی لینڈ ـ ہانگ کانگ ۲۱۰/ روپے
نائیجیریا ـ آسٹریلیا ـ نیوزی لینڈ ۱۶۰/ روپے ● سعودی عرب ـ عرب امارات ـ مسقط ـ بحرین ـ عراق ـ ایران ـ مصر ـ کویت ۱۳۰/ روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ "البلاغ" دار العلوم کراچی ۱۴ فون نمبر: ۳۱۱۲۱۷
پبلیشر: محمد تقی عثمانی ـ دار العلوم کراچی ۱۴ پرنٹر: مشہور آفسٹ پریس کراچی

ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ذکر و فکر

شریعت بل اور نفاذ شریعت کی حکمت عملی

حمد و ستائش اُس ذات کے لئے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا

اور

دُرود وسلام اُس کے آخری پیغمبرؐ پر جنھوں نے دُنیا میں حق کا بول بالا کیا

کئی ماہ پہلے میں نے ان صفحات میں سینٹ میں پیش ہونے والے "شریعت بل" کے سلسلے میں کچھ گذارشات پیش کی تھیں، اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا تھا کہ اس بل پر جو اعتراضات کئے جارہے ہیں، ان پر اپنا قدرے تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ کسی آئندہ اشاعت میں پیش کروں گا۔ لیکن افسوس ہے کہ مختلف مشاغل کی وجہ سے اس اعلان پر ابتک عمل نہیں کر سکا۔

اس دوران اس بل کو "رائے عامہ" حاصل کرنے کے لئے مشتہر کر دیا گیا، اگرچہ اس بل کو "رائے عامہ" کے لئے مشتہر کرنا ہماری نظر میں قطعی طور پر بے معنی اور بلاجواز تھا، کیونکہ اگر رائے اس بات پر لینی مقصود تھی کہ اس ملک میں شریعت کی بالادستی قائم ہو یا نہ ہو؟ تو اس سے زیادہ افسوسناک بات کوئی نہیں ہو سکتی۔ اوّل تو شریعت رائے عامہ کی محتاج نہیں ہے کہ اگر "رائے عامہ" موافق ہو تو شریعت پر عمل کیا جائے اور موافق نہ ہو تو اسے ــــ معاذ اللہ ــــ مسترد کر دیا جائے، شریعت تو اٹل خدائی قانون ہے جس کے واجب العمل ہونے کے لئے ووٹ گننے کی ضرورت نہیں، اور اگر خدانخواستہ رائے عامہ کا ایک ووٹ بھی اس کے حق میں نہ آئے تب بھی اس کے واجب العمل ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

دوسرے شریعت کے معاملے میں اہلِ پاکستان کی رائے عامہ ایک مرتبہ نہیں بار بار سامنے آچکی ہے، اور اسی دن آچکی ہے جس دن یہ ملک اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا اور اس کا تازہ ترین واقعہ پچھلے سال کا ریفرنڈم اور اس کے بعد امیدواروں کا مشترک انتخابی منشور ہے اس کے بعد اس سلسلے میں شک یا غلط فہمی کا کوئی جواز نہیں

ہے کہ پاکستانی عوام شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں یا نہیں؟

اور اگر اس بل کو رائے عامہ کے لئے مشتہر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نفاذ شریعت کے لئے جو عملی طریقے اس بل میں تجویز کئے گئے ہیں، ان کے بارے میں لوگوں کی رائے معلوم کی جائے کہ وہ عملی اعتبار سے مناسب ہیں یا نہیں؟ اور اگر نہیں تو کون سا متبادل طریقہ مناسب ہوگا؟ تو یہ مسئلہ "رائے عامہ" کا نہیں بلکہ علمی اور فنی نوعیت کا مسئلہ تھا جسے عوامی سطح پر نہیں بلکہ اختصاصی ماہرین کے مشورے ہی سے حل کیا جاسکتا ہے ——— لہٰذا بل کو "رائے عامہ" کے لئے مشتہر کرنا دونوں صورتوں میں بے معنی اور قطعی طور پر بلا جواز تھا۔

بہرحال یہ مرحلہ بھی گزر گیا، اور اب یہ بل دوبارہ سینٹ میں پیش ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اس بل کے نفاذ کے عملی مسائل پر قدرے وضاحت اور تفصیل سے گفتگو کی جائے۔

اس بل کے مخالفین دو قسم کے ہیں، ایک تو وہ جنھیں شریعت کے نام ہی سے چڑ ہے، اور جو اس ملک میں اسلامی قوانین کا نفاذ دل سے چاہتے ہی نہیں، اس وقت ایسے لوگوں سے خطاب مقصود نہیں، ان کے لئے تو دعائے ہدایت کے کیا کیا جاسکتا ہے۔

البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اصولی طور پر اسلامی قوانین کے نفاذ کے مخالف نہیں، لیکن جب وہ اس کے عملی مسائل کے بارے میں سوچتے ہیں تو ان کے ذہنوں میں متعدد الجھنیں پیدا ہوتی ہیں جنھیں وہ لاینحل سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ نفاذِ شریعت کی نہیں، بلکہ اس کے طریقِ کار کی مخالفت کرتے ہیں جو شریعت بل میں تجویز کیا گیا ہے، اس وقت ہم انہی عملی مسائل کا مثبت طور پر جائزہ لینا چاہتے ہیں تاکہ مسئلہ پوری طرح واضح ہوسکے۔

اصل بات یہ ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین نافذ کرنے کے دو ہی طریقے ہوسکتے ہیں:

(۱) ایک طریقہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کو "قانونِ موضوعہ" کی شکل ([illegible]) میں مدون کیے بغیر صرف ایک دو سطری قانون نافذ کر دیا جائے کہ "ملک کی تمام عدالتیں فلاں تاریخ سے تمام مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق کریں گی"۔

اس کے بعد یہ ہر عدالت کا فرض ہوگا کہ وہ ہر مقدمے میں اپنے طور پر یہ فیصلے کرے کہ اس معاملے میں شریعت کا قانون کیا ہے؟ اس غرض کے لئے وہ خود فقہ اور اسلامی قانون کی کتابوں کی طرف رجوع کریگی اور ان کتابوں سے زیر بحث مسئلے میں اسے اسلامی قوانین کا جو تقاضا سمجھ میں آئے گا اس کے مطابق فیصلہ کریگی۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسلامی قانون کو باقاعدہ "قانون موضوعہ" کی شکل میں ([illegible]) مدون کیا جائے پھر عدالتوں پر لازم کیا جائے کہ اس مدون قانون کے مطابق فیصلے کریں۔

ان طریقوں میں سے ہر ایک میں کچھ فوائد ہیں، اور کچھ عملی مشکلات!

جہاں تک پہلے طریقے کا تعلق ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نفاذِ شریعت کے لئے ایک دن کا بھی انتظار ضروری نہیں اور ہر قاضی اپنے ضمیر کے مطابق جو شریعت کا تقاضا سمجھے اس کے مطابق فیصلہ کر سکتا ہے عالم اسلام میں صدیوں

اسی پر عمل ہوتا رہا ہے، سعودی عرب اب بھی اسی طریقے پر کاربند ہے، غیر اسلامی معاشروں میں برطانیہ کے دستوری معاملات کے فیصلے بھی اسی طرح "غیر مدون" قانون کے تحت ہوتے ہیں، اور خود ہمارے ملک میں شخصی قوانین [illegible] کے بیشتر مقدمات کا فیصلہ بھی اسی طریق کار کے تحت ہوتا ہے۔

لیکن یہ نظام اس وقت تو بہترین طریقے پر چل سکتا ہے جب عدالتوں میں بیٹھے ہوئے جج صاحبان ایک طرف تو اسلامی قانون سے نہ صرف پوری طرح واقف ہوں بلکہ اس کی اعلیٰ درجے کی مہارت رکھتے ہوں، اور دوسری طرف دیانت وامانت کے اعلیٰ معیار کے حامل ہوں۔

ہمارے ملک میں ان دونوں شرائط کی افسوسناک کمی کی وجہ سے اس طریق کار میں عملی دشواریاں مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) ہماری عدالتوں کے موجودہ جج صاحبان کی تمام تربیت انگریزی قانون میں ہوئی ہے اور اسلامی قانون سے انھیں یا تو بالکل واسطہ نہیں پڑا، یا پڑا ہے تو بہت کم اور ناتمام، لہٰذا اسلامی قانون سے ان کی ناواقفیت ایک طبعی امر ہے، جو نہ کوئی راز ہے، اور نہ قابل تعجب۔

ایسے حالات میں جبکہ اسلامی قانون کے اصل مآخذ عربی زبان میں ہیں ہر ہر مقدمے کے بارے میں ان کے لئے صحیح شرعی قانون تک از خود رسائی حاصل کرنا مشکل بھی ہے، اور دیر طلب بھی، اور اس میں غلطیوں کا احتمال بھی بہت زیادہ ہے۔

(۲) اگر بالفرض یہ بھی طے کر لیا جائے کہ تمام عدالتوں میں ایسے قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا جو اسلامی علوم میں مکمل مہارت رکھتے ہوں تو تمام اہل علم جانتے ہیں کہ ہر عالم کو فقہ سے مناسبت نہیں ہوتی اور فتویٰ تک کے لئے مستقل تربیت درکار ہوتی ہے، قضا کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ نازک اور اہم ہے، اور عرصہ دراز سے اس کی تربیت کا بھی کوئی قابل ذکر اہتمام نہیں ہوا، لہٰذا ایسے ماہر قاضیوں کا ملنا جو ملک بھر کی ضرورت پوری کر سکیں بہت دشوار ہے۔

اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب صرف "راولپنڈی ڈویژن" میں قاضیوں کی عدالتیں قائم کرنے کی بات چلی تھی، اُس وقت اندازہ لگایا گیا تو صرف ایک "راولپنڈی ڈویژن" میں پینتالیس قاضی درکار تھے پورے ملک کی عدالتوں کے لئے قاضیوں کی جتنی بڑی تعداد درکار ہوگی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور بحالات موجودہ ایسے ماہر قاضیوں کی اتنی بڑی تعداد کا حصول بہت مشکل نظر آتا ہے۔

(۳) فقہ اور اسلامی قانون کی کتابیں بلاشبہ اسلامی قانون کو سمجھنے میں بہت مددگار ثابت ہونگی لیکن جس زمانے میں یہ کتابیں لکھی گئی ہیں اُس میں بہت سے ایسے مسائل پیدا نہیں ہوئے تھے اس لئے ان مسائل کا صریح جواب ان کتابوں میں نہیں ملتا، بلکہ ایک فقیہ کو ایسے مواقع پر فقہ کے عمومی مسائل وقواعد کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ یہ مسئلہ کون سے اصول یا قاعدے پر منطبق ہوگا؟ یہ فیصلہ بہت باریک بینی اور فقہ وفتویٰ کا وسیع تجربہ چاہتا ہے اور بعض اوقات اس فیصلے تک پہنچنے کے لئے اچھے اچھے ماہر مفتیوں کو بھی کافی دن لگ جاتے ہیں، لہٰذا مدون قانون کی عدم موجودگی میں جب قاضی ان مسائل کا شرعی حکم معلوم کرنا چاہے گا تو اسے کافی وقت لگے گا، اور اس طرح مقدمات میں تاخیر اور تعویق کا بھی امکان ہے۔

(۴) جن مسائل کا صریح حکم کتاب وسنّت یا فقہ اسلامی کی کتابوں میں موجود نہیں ہے، اور ان میں فقہی اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر استنباط کرنا پڑتا ہے، اس میں استنباط کرنے والوں کی آراء میں اختلاف بھی ہوتا ہے، لہٰذا یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف عدالتیں ایک ہی جیسے مقدمے میں مختلف فیصلے کریں اور اس طرح فیصلوں میں یکسانیت برقرار نہ رہے۔

(۵) جب قانون مدوّن شکل میں عدالت کے سامنے ہوتا ہے اور اسے ہر حال میں اس قانون کی پیروی کرنی پڑتی ہے، تو کم از کم قانون کے اطلاق کی حد تک جج کی بددیانتی کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ لیکن جب قانون مدوّن شکل میں موجود نہ ہو، تو اگر جج بددیانت ہے تو وہ قانون کو موم کی ناک بنا کر جس طرح چاہے اس کی تشریح کرسکتا ہے، اور اسے بددیانتی کا ایک اور ہتھیار ہاتھ آسکتا ہے۔

یہ ہیں وہ عملی مسائل جو ہمارے ملک میں اسلامی قانون کو غیر مدوّن صورت میں نافذ کرنے سے پیدا ہوسکتے ہیں، اور جو بہت سے ذہنوں میں خلجان پیدا کررہے ہیں۔

نفاذِ شریعت کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قانون کو مدوّن (Codified) شکل میں مرتب کیا جائے اس کے بعد عدالتوں کو اس کا پابند بنا کر اسے نافذ کیا جائے، اس طریقے میں وہ خرابیاں تو کم ہوں گی جن کا ذکر پہلے طریقے کے ذیل میں اوپر گذر چکا ہے، لیکن اس میں دوسری قسم کے عملی مسائل کا سامنا کرنا ہوگا، یہ مسائل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) نفاذِ شریعت کے لئے تدوینِ قانون کا انتظار کرنے کے معنی ہمارے موجودہ حالات میں یہ ہوں گے کہ نفاذِ شریعت کے کام کو غیر معینہ مدت کے لئے التواء میں ڈال دیا جائے۔

(۲) مدوّن قانون کی تسوید (Drafting) نہایت نازک کام ہے جس میں انتہائی باریک بینی اور علم کی وُسعت وعمق کی ضرورت ہے، چونکہ تدوینِ قانون کے بعد عدالتیں اس کے ایک ایک لفظ کی پابند ہوجاتی ہیں، بہت سوچ سمجھ کر قانون کا حصّہ بنانا پڑتا ہے، تاکہ وہ الفاظ تمام ممکنہ صورتوں کا احاطہ کرسکیں، لہٰذا اس کام میں دیر لگنا ایک طبعی امر ہے۔

اس کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کے آخری دور میں اسلام کے دیوانی قانون کو مدوّن کرنے کے لئے علماء کی ایک جماعت بنائی گئی۔ ان کے سپرد صرف دیوانی قانون کی تدوین وتسوید تھی، اور یہ بھی طے تھا کہ وہ یہ قانون فقہِ حنفی کے مطابق مرتب کریں گے اس مجلس کے ارکان میں اس وقت کے چوٹی کے علماء شامل تھے، علامہ ابن عابدین شامیؒ کے صاحبزادے علامہ علاؤ الدین ابن عابدینؒ صاحب تکملۂ رد المحتار بھی اس کے رکن رکین تھے۔ اس مجلس نے "مجلۃ الأحکام العدلیۃ" کے نام سے اسلام کے دیوانی قانون کو مرتب کیا تو اس کی تسوید وترتیب میں بھی تقریباً آٹھ سال صرف ہوئے۔

ابتک انگریزی قانون کا جو قانون شہادت (۱۸۷۲ء) ہمارے ہاں نافذ رہا ہے اسے تسوید قانون کا شاہکار سمجھا جاتا ہے لیکن اس کی تنفیذ کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کی تسوید سے لے کر تنفیذ تک اٹھارہ سال کی مدت خرچ ہوئی۔

(۳) پھر اگر تسوید و ترتیب کا مرحلہ بھی کسی طرح جلدی حل ہو جائے تو موجودہ جمہوری نظام حکومت میں اسے پارلیمنٹ کے دو ایوانوں میں پیش ہو کر کم از کم اکثریت کی حمایت درکار ہے اور جب تک اس کی ایک ایک شق پر پارلیمنٹ میں مفصل بحث نہ ہو جائے وہ نفاذ کے مرحلے تک نہیں پہنچ سکتا اور پارلیمنٹ کے ارکان اس بنیاد پر منتخب نہیں ہوتے کہ وہ اسلامی قانون سے کتنی واقفیت رکھتے ہیں اس لئے اکثریت کے لئے اسلامی قانون اجنبی ہوتا ہے، چنانچہ وہ اس پر ایسے ایسے اعتراضات کھڑے کرتے ہیں جن کی جواب دہی کے لئے ایک مدت چاہیئے، اور پھر بھی ان کا ہر ہر جزوی مسئلے میں مطمئن ہونا ضروری نہیں، اس لئے عین ممکن ہے کہ جو مسودہ قانون اسلامی علوم کے ماہرین نے تیار کیا ہو اس میں وہ ایسی ترمیمات کر دیں جن سے وہ مکمل طور پر شریعت کے مطابق باقی نہ رہے۔

اس بات کا کچھ اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ "حدود آرڈیننس" تو مارشل لاء کے زمانے میں پارلیمنٹ کے مراحل سے گذرے بغیر جوں توں کر کے نافذ ہو گیا تھا لیکن اسی کے کچھ عرصہ بعد اسلامی نظریاتی کونسل نے، "قصاص و دیت" کے قانون کا مسودہ بھی تیار کر لیا تھا، اور کچھ ہی عرصہ بعد "شفعہ" کے قانون کا بھی لیکن پانچ سال سے زائد مدت گذرنے کے بعد یہ مسودات آج تک نافذ نہیں ہوئے، بلکہ پارلیمنٹ میں برائے غور پیش بھی نہیں ہوئے۔

دوسری طرف اسلامی نظریاتی کونسل نے "اسلامی قانون شہادت" کا ایک مسودہ تیار کیا تھا، یہ مسودہ سابق "مجلس شوریٰ" میں (جو اس وقت ایک پارلیمنٹ کی سی حیثیت رکھتی تھی) پیش ہوا، لیکن طویل بحث و تمحیص کے نتیجے میں اس کا حلیہ اس طرح بگڑا کہ وہ مسودہ تو خواب و خیال ہو گیا اور اس کی جگہ ۱۸۷۲ء ہی کے قانون شہادت کو چند ترمیمات کے ساتھ "اسلامی قانون شہادت" کے نام سے نافذ کر دیا گیا، جس کے بارے میں شاید یہ تو کہا جا سکے کہ اس کی کوئی دفعہ براہِ راست قرآن و سنت سے متصادم نہیں ہے، لیکن یہ کہنا زیادتی ہوگی کہ وہ "اسلامی قانونِ شہادت" ہے یا اس کے ذریعے اسلام کے قانونِ شہادت کے تمام تقاضے پورے ہو گئے ہیں۔

اگر اسلامی قانون کو مدوّن شکل میں نافذ کرنے کے لئے ہر ہر مسودہ قانون ان تمام مراحل سے گذرا جن سے یہ مسودات گذرے ہیں تو قانون شریعت کے مکمل نفاذ کے لئے عمر نوح اور صبر ایوب درکار ہو گا اور اس کے معنی سوائے اس کے کیا ہوں گے کہ نفاذ شریعت کے اہم کام کو چالیس سال گذرنے کے بعد بھی غیر معین اور غیر محدود مدت کے لئے التوا میں ڈال دیا جائے۔

(۴) اسلام کا نظام قانون، اس کے اہداف و مقاصد اور اس کے نفاذ کا طریقہ کار موجودہ انگریزی قانون سے اساسی طور پر مختلف ہے، اور ہر نظام قانون اسی وقت صحیح نتائج پیدا کر سکتا ہے، جب اسے آدھا تہائی نہیں، پورے کا پورا اختیار کیا جائے، زندگی کے کسی خاص ایک شعبے میں تو اسلامی قانون نافذ ہو، اور باقی تمام شعبوں میں انگریزی قانون کی عملداری جاری رہے تو اس سے نہ صرف یہ کہ مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ

اس سے معاشرے میں واضح تضاد پیدا ہوتا ہے جو دو عملی اور دو رنگی کی وجہ سے کبھی عدل وانصاف کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔

نفاذ شریعت کے لئے تدوین کے انتظار سے ایک مدت دراز تک اس تضاد کا باقی رہنا ناگزیر ہے، اس لئے کہ "تدوین" کے طریقے کا حاصل یہ ہے کہ مکمل اسلامی قانون یکبارگی نافذ نہیں ہوگا، بلکہ جتنے جتنے قانون کی تدوین ہوتی جائے گی، اتنا اتنا نافذ ہوتا جائے گا اور باقی قوانین حسب سابق نافذ العمل رہیں گے، لہٰذا جب تک مکمل اسلامی قانون مدون ہو کر نافذ نہ ہو، یہ دو عملی اور دو رنگی، جو بعض اوقات بڑے مضحکہ خیز اور بسا اوقات بڑے ظالمانہ نتائج پیدا کرتی ہے، مسلسل جاری رہے گی۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اس وقت ہمارے ملک میں "حدود آرڈیننس" بفضلہ تعالیٰ نافذ ہے، جسے شریعت کے مطابق مدون کر کے نافذ کیا گیا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اس محدود دائرے میں تو شریعت کا قانون چل رہا ہے لیکن دوسرے بیشتر قوانین بدستور انگریزی قانون کے مطابق نافذ ہیں۔ ضابطے کے قوانین وہی ہیں، تفتیش اور استغاثہ کا نظام وہی ہے اور ان معدودے چند جرائم کے سوا باقی جرائم اور ان کی سزاؤں کے سلسلے میں بھی وہی انگریزی قوانین نافذ ہیں جو اگر قرآن وسنت سے واضح طور پر متصادم نہ بھی ہوں تو ان کا مزاج اور ان کے مقاصد اسلامی قانون کے مزاج اور مقاصد سے مختلف ہیں۔

چنانچہ اس وقت شاید ہمارے ملک میں تمام جرائم میں سب سے سخت سزائیں بدکاری اور اس کے متعلقات کی ہیں (اور ہونی بھی چاہئیں کہ شریعت کا تقاضا بھی یہی ہے) لیکن دوسری طرف اس بدکاری پر ابھارنے والے عوامل واسباب کو دور کرنے کے لئے کوئی موثر قانون موجود نہیں ہے اور جو مجرم بھی اس جرم میں پکڑا جاتا ہے وہ گویا زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ ؎

اندرون قعر دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش[1]

اس کی ایک اور واضح مثال یہ ہے کہ "حدود آرڈیننس" میں "زنا" کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "جائز نکاح کے بغیر مرد وعورت کا جنسی عمل انجام دینا" دوسری طرف عائلی قوانین بھی نافذ ہیں جن کی دفعہ ۷ کی رُو سے جب تک کوئی شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد یونین کونسل کو اس کا نوٹس نہ بھیجے، وہ طلاق قانوناً معتبر نہیں ہوتی، ایسی صورت میں اگر کوئی عورت طلاق کو شرعاً مؤثر سمجھ کر عدت کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح کرلے

---

[1] بعض حضرات اس دلیل کی بنیاد پر یہ کہتے ہیں کہ جس معاشرے میں بدکاری پر ابھارنے والے عوامل اس کثرت سے پائے جاتے ہوں، وہاں (معاذ اللہ) حدود شرعیہ کا نفاذ ظلم ہے، حالانکہ بات الٹی ہے، یعنی یہ کہ حدود شرعیہ تو اللہ کا حکم ہونے کی حیثیت سے نافذ ہونی ہی چاہئیں لیکن ان کے ساتھ ایسے اسباب وعوامل کو باقی رکھنا ظلم ہے۔

توشرعاً وہ معتبر ہے، لیکن چونکہ یہ دوسرا نکاح عائلی قوانین کی رو سے جائز نہیں، اس لئے ایسی عورتوں کے خلاف زنا کے مقدمات قائم ہو جاتے ہیں اور بعض خواتین کو اس بنا پر سزائیں بھی ہوئیں ہیں۔

غرض "حدود آرڈیننس" کے نفاذ کے ساتھ دوسرے انگریزی قوانین کے نفاذ اور بحیثیتِ مجموعی اسی نظامِ قانون کی عملداری سے دوعملی اور دورنگی کے بہت سے مظاہر روزمرہ سامنے آتے رہتے ہیں۔

(۵) اسلامی قانون کو مدوّن شکل میں نافذ کرنے کے سلسلے میں پانچواں عملی مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون کے مدوّن ہونے کی صورت میں عدالتیں قانون کے ایک ایک لفظ، بلکہ ایک ایک نقطے شوشے کی اس طرح پابند ہو جاتی ہیں کہ کسی بھی حالت میں اس سے سرِمُو باہر نہیں نکل سکتیں، اور جہاں تک قانون موضوعہ (Statute) کے الفاظ کا تعلق ہے، ان کے عملی اطلاق میں ان کے لئے کوئی لچک باقی نہیں رہتی۔

دوسری طرف بدلتے ہوئے حالات میں ایسے ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ ان میں بعض اوقات اُس بے لچک قانون کا اطلاق دشواریوں کا سبب بنتا ہے، اور شریعت کے مطابق بھی نہیں ہوتا، قانون کو الفاظ کا جامہ پہنا کر مدوّن کرنے والا، خواہ قانون کا کتنا ہی ماہر ہو، اور متعلقہ حالات کا احاطہ کرنے کی کتنی کوشش کرلے، لیکن بہر حال وہ ایک انسان ہوتا ہے، اُس سے بھول چوک بھی ممکن ہے، اور آنے والے تمام حالات کا پیشگی اندازہ کرنا بھی اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن اس نے جو الفاظ قانون میں لکھ دیئے ہیں، عدالتیں ہر صورت میں اس کی پابند ہو جاتی ہیں، اور خواہ ایسے واقعات پیش آجائیں جن کا اندازہ قانون مدوّن کرنے والے کو نہیں تھا عدالتیں انہی الفاظ کی مکمل پیروی پر مجبور ہوتی ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ "حدود آرڈیننس" میں اغوا کی سزا تعزیراً سزائے موت رکھی گئی ہے، اور اغوا کے جو سنگین واقعات شب و روز پیش آتے رہتے ہیں، ان کے پیشِ نظر یہ سزا کچھ ایسی سخت نہیں ہے اور غالباً تدوینِ قانون کے وقت ایسے ہی سنگین واقعات پیشِ نظر رہے ہوں گے، لیکن "اغوا" کی جو تعریف مجموعہ تعزیرات پاکستان میں درج ہے، اُس کی رُو سے اگر کوئی شخص کسی بچی کو بہلا پھُسلا کر نصف فرلانگ کے فاصلے تک بھی لے جائے اور اس کے بعد وہ بچی کسی ذریعے سے واپس اپنے گھر آجائے، تب بھی وہ قانوناً "اغوا" ہی شمار ہوتا ہے جس کی سزا موت کے سوا کچھ اور نہیں ــــــ اس میں شک نہیں کہ یہ عمل بھی ایک سخت جرم ہے، لیکن بہت سے مقدمات کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ ان میں موت کی آخری سزا دینا زیادتی معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ قانون میں "اغوا" کی سزا موت ہے اس لئے عدالت تخفیف کی ضرورت محسوس کرنے کے باوجود تخفیف نہیں کر سکتی۔

اس قسم کی خرابیوں کا ازالہ قانون کی تبدیلی سے ممکن ہے، لیکن قانون کی تبدیلی ایک طویل عمل ہے جس کے لئے بعض اوقات کئی کئی سال درکار ہوتے ہیں، اور اس درمیانی مدت میں اس خرابی کا کوئی علاج ممکن نہیں ہوتا۔

یہ ہیں وہ عملی مسائل اور مشکلات جو اسلامی قانون کو مدوّن کرکے نافذ کرنے سے ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا تشریح سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ قانونِ شریعت کے نفاذ کے لئے جو دو طریقے ہو سکتے ہیں ان میں سے ہر ایک میں کچھ خوبیاں ہیں، اور ہر ایک کی کچھ عملی مشکلات اور اس کے کچھ مسائل ہیں جن کا حل ہر صورت میں نکالنا ہوگا۔

اس سے سب سے پہلے تو ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہونی چاہیئے جو ان دو طریقوں میں سے کسی ایک ہی طریقے کو مشکلات کا سبب سمجھ کر اس کی کلی مخالفت، اور دوسرے کو بے خطر محسوس کرکے اس کی کلی حمایت کرتے ہیں ـــــ لہذا جو لوگ مجوزہ شریعت بل کی اس بنا پر مخالفت کر رہے ہیں کہ ابھی اسلامی قانون مدوّن شکل میں موجود نہیں ہے، اور غیر مدون قانون کا نفاذ پُر خطر ہے، ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ جس طرح بعض خطرات غیر مدون قانون کے نفاذ میں نظر آتے ہیں، اسی طرح بہت سے خطرات ـ جنمیں سے بعض بہت سنگین نوعیت کے ہیں ـ مدون قانون کے نفاذ میں بھی ہیں۔ لہذا صرف پہلے ہی طریقے کو مورد الزام ٹھہرا کر اس کی مخالفت کوئی صحیح طریق کار نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب دونوں طریقوں میں کچھ نہ کچھ عملی مشکلات ہیں تو پھر نفاذِ شریعت کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے مذکورہ بالا مسائل پیدا نہ ہوں، یا ان کا کوئی مناسب حل نکل آئے؟

اس سوال کے جواب سے پہلے چند بنیادی امور ذہن نشین کرنے ضروری ہیں:

(۱) اوپر نفاذِ شریعت کے دونوں طریقوں میں جن عملی مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ابدی اور مستقل نوعیت کی نہیں ہیں، بلکہ عبوری اور عارضی نوعیت کی ہیں جن پر مستحکم منصوبہ بندی کے ذریعے کچھ عرصے میں قابو پایا جا سکتا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ عبوری دور پہلے طریقے میں کم اور دوسرے طریقے میں زیادہ طویل ہوگا۔

(۲) جو نظام سالہا سال سے کسی جگہ اپنی جڑیں جمائے ہوئے ہو، اُسے بدل کر کوئی دوسرا نظام لانا ہمیشہ کچھ عملی مسائل اور مشکلات کا سبب ہوتا ہے، لیکن اگر دلوں میں اس بات کا عزم موجود ہو کہ اس نظام کو ہر قیمت پر بدلنا، اور اس راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنا ہے، تو مشکلات خواہ کتنی سنگین نوعیت کی ہوں، انسان ان پر قابو پالیتا ہے اور مشکلات کے عبوری دور سے گذرنے کے بعد بالآخر اسے منزلِ مقصود حاصل ہو جاتی ہے۔

(۳) اگر کسی جگہ ایک لادینی نظام کی جگہ دوسرا لادینی نظام لانا مقصود ہو تو وہاں بیشک انسان کو یہ سوچنا چاہیئے کہ اس انقلاب کے لئے جن مشکلات کو عبور کرنا ہوگا، اور جو قربانیاں دینی پڑیں گی، وہ زیادہ ہیں، یا انقلاب سے حاصل ہونے والے فوائد زیادہ ہیں؟ ـــــ لیکن اسلامی قانون اللہ کا قانون ہے، اسے نافذ کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ ہمارے انتخاب اور اختیار کا مسئلہ نہیں، بلکہ ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے لازم ہے کہ اُسے ہر قیمت پر نافذ کریں، خواہ اس کے لئے کتنی مشکلات سے گذرنا پڑے،

کتنی قربانیاں دینی پڑیں، اور خواہ اِس دنیا میں اُس کے بہتر نتائج سامنے آنے کی توقع ہو یا نہ ہو۔

یوں تو اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی تعمیل بالآخر دنیا میں بھی بیشمار فوائد و ثمرات کا سبب ہوتی ہے، لیکن ہم اللہ کے بندے ہیں اور ہمیں اس کے حکم کی تعمیل اس لئے نہیں کرنی چاہیئے کہ اس سے وہ دنیوی فوائد حاصل ہوں گے، بلکہ اس لئے کرنی چاہیئے کہ وہ اللہ کا حکم ہے، اور ہر حالت میں واجب التعمیل ہے، خواہ اس سے فوائد حاصل ہوں یا نہ ہوں۔

(۴) بلاشبہ اسلام نے ہمیں وسائل و اسباب کو مناسب حد تک اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن کسی عمل کی کامیابی اور ناکامی میں مادّی وسائل و اسباب ہی سب کچھ نہیں ہوتے، کامیابی دینا یا نہ دینا ان وسائل و اسباب کے خالق کا کام ہے، وہی ان مسائل میں تاثیر پیدا کرنے والا ہے، اگر اس کی ذات پر بھروسہ ہو تو وہی بعض اوقات ایسے وسائل پیدا فرماتا ہے جن کا پہلے سے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔

لہٰذا اگر لادینی انقلاب کے علمبردار راستے کی ہزار رکاوٹوں کے باوجود اپنے عزم و ہمت کی بدولت ان رکاوٹوں کو عبور کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدد نہیں فرمائے گا جو اُس کے احکام کو نافذ کرنے اور اس کے دین کو سربلند کرنے کے لئے عزم و ہمت کا مظاہرہ کریں گے؟ اگر ہمیں اللہ تعالیٰ کی قُدرتِ کاملہ اور رحمتِ واسعہ پر اتنا بھی ایمان نہیں ہے تو پھر ہمیں "نفاذِ اسلام" کا نام لینا چھوڑ ہی دینا چاہیئے۔

مسلمانوں کے عہد کامیابی کی پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ انھوں نے وسائل و اسباب کو ایک حد تک ضرور اختیار کیا، لیکن ان کا اصل بھروسہ اللہ کی ذات پر تھا، اور ایسے مواقع پر راستے کی ہزار رکاوٹوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں کبھی ناکام نہیں فرمایا۔

اس کی ایک بہت چھوٹی سی تازہ ترین مثال پی آئی اے کی پروازوں میں شراب کی بندش ہے، جب تک بندش کا یہ قانون نافذ نہیں ہوا تھا، اس وقت تک چاروں طرف سے حکومت کو اعداد و شمار کے ڈراؤنے خواب دکھا کر یہ جتایا جا رہا تھا کہ اس بندش کے نتیجے میں ائیر لائنز کو ناقابلِ تحمل خسارہ ہوگا، لیکن جب حکومت نے اللہ کے بھروسے پر یہ عزم کر لیا تو خود صدرِ مملکت نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ اس بندش کے بعد نہ صرف یہ کہ کوئی خسارہ نہیں ہوا، بلکہ نفع میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوگیا۔

(۵) اور آخری بات یہ ہے کہ نفاذِ شریعت کے مقصد میں کامیابی اور مذکورہ رکاوٹوں کا مؤثر ازالہ اس طرح ہرگز نہیں ہوگا کہ ہم ایک دو صفحے کا بل اسمبلی سے منظور کر کے سو جائیں، اور اس کے عملی اطلاق کے مسائل سے آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے برعکس "نفاذِ شریعت" ایک انتہائی اہم کام ہے، جس کے لئے ایک مستحکم عزم و یقین، سوچے سمجھے منصوبے اور ایک عرصے تک متواتر جد و جہد کی ضرورت ہوگی اور یہ کام صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب حکومت "نفاذِ شریعت" کے کام کو نیم دلانہ انداز میں کرنے کے بجائے اسے اپنے فکر و عمل کا خصوصی موضوع بنائے، اس

سلسلے میں بروقت مناسب اقدامات کرنے کے لئے اس موضوع کو اپنی ترجیحات کی فہرست میں سب سے اوپر رکھے، اور ساتھ ہی یہ بات اپنے دل میں پختہ طور پر راسخ کرے کہ ان اقدامات کا اصل مقصد مخلوق کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے، جس کے لئے کچھ نہ کچھ حلقوں کی ناراضی ایک عرصہ کے لئے مول لینی پڑے گی۔

اگر ان بنیادی امور کو ذہن نشین کرکے حکومت یہ مبارک کام انجام دے تو انشاء تعالیٰ کچھ ہی عرصے میں مشکلات کے بادل چھٹ جائیں گے، اور مطلع نفاذ شریعت کے لئے صاف ہو جائے گا۔

ان پانچ بنیادی امور کی تمہید کے بعد اب میں اصل سوال کی طرف آتا ہوں کہ "نفاذ شریعت" کے مذکورہ دو طریقوں میں سے کونسا طریقہ ہمارے حالات کے لئے زیادہ مناسب ہے۔

پچھلے نو سال میں ملک کے اندر "اسلامائزیشن" کی جو اصطلاح وضع ہوئی، اور اس کے تحت جو مختلف اقدامات ہوئے ہیں، میں ان میں سے بیشتر میں کسی نہ کسی حیثیت سے دخیل رہا ہوں، اس لئے متعلقہ مسائل کو سوچنے سمجھنے اور ان کو اپنے غور وفکر کا موضوع بنانے کا موقع ملا ہے اس پورے عرصے کی سوچ بچار اور کسی حد تک عملی تجربے کی روشنی میں میری رائے یہ ہے کہ ہمارے ملک میں "نفاذِ شریعت" کے لئے دونوں طریقے بیک وقت اختیار کرنے ضروری ہیں۔

میرے نزدیک ایک طرف یہ ضروری ہے کہ اسلامی قانون کی تدوین کا کام پوری سنجیدگی، اہمیت اور ممکنہ تیز رفتاری کے ساتھ شروع کیا جائے۔ لیکن دوسری طرف "نفاذ شریعت" کے لئے اس کام کی تکمیل کا انتظار بھی درست نہیں، بلکہ دوسری طرف "شریعت بل" کے ذریعے عدالتوں کو شریعت کے مطابق فیصلے کرنے کا پابند بنا دینا چاہئیے جس کا طریق کار مندرجہ ذیل خطوط پر طے کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) رائج الوقت قوانین میں بھاری تعداد، بلکہ اکثریت ایسے قوانین کی ہے جو محض انتظامی نوعیت کے ہیں، اور ان سے کوئی حلال وحرام یا جائز وناجائز کا مسئلہ متعلق نہیں ہے۔ اور نہ ان میں اسلام سے بنیادی تصورات کا کوئی اختلاف ہے، اگر کہیں کوئی جزوی بات اسلامی احکام کے خلاف ہے بھی تو وہ بہت معمولی نوعیت کی ہے، اصولی نوعیت کی نہیں، ایسے قوانین کا اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت پچھلے پانچ چھ سال میں قرآن و سنت کی روشنی میں جائزہ لے چکی ہیں، ایسے قوانین کو بالکلیہ منسوخ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یہ اصول طے کیا جا سکتا ہے کہ جن قوانین کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت یہ رپورٹ دے چکی ہے کہ ان میں کوئی بات قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہے، یا ان میں انھوں نے معمولی نوعیت کی اکا دکا ترمیمات پیش کی ہیں، ان کو فی الحال اسی تصریح کے ساتھ نافذ العمل رہنے دیا جائے کہ اگر عدالت پر ان قوانین کے کسی حصے کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ وہ شریعت کے خلاف ہے تو شریعت کا حکم بالا ہوگا۔

(۲) اگر "قصاص ۔۔ دیت" کا مس۔۔ قان۔۔

رائج الوقت فوجداری قوانین کو بھی منسوخ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، کیونکہ "حدود آرڈیننس" پہلے ہی نافذ ہے، لہذا جبتک نئے فوجداری قوانین از سرِ نو مدون نہ ہوں، اس وقت تک موجودہ فوجداری قوانین کو بھی اسی تصریح کے ساتھ نافذ رکھا جاسکتا ہے کہ تعارض کے وقت شریعت کا حکم بالا ہوگا۔

(۳) اب صرف ان دیوانی اور ضابطے کے قوانین کا معاملہ رہ جاتا ہے جس میں موجودہ قوانین اور شریعت کے درمیان بنیادی تصورات کا اختلاف ہے، مثلاً قانونِ معاہدہ، قانونِ بیع، انتقال جائیداد وغیرہ، ایسے قوانین کو بیشک منسوخ کرنا ہوگا لیکن اس دائرے میں عدالتوں کو شریعت کے مطابق فیصلے کرنے کے لئے مندرجہ ذیل رہنما کتابوں سے استفادے کا پابند بنایا جائے:

(۱) مجلۃ الاحکام العدلیۃ: یہ خلافتِ عثمانیہ کے دور کا مدون دیوانی قانون ہے جو زمانہ حال تک بہت سے ملکوں، مثلاً کویت، اردن وغیرہ میں نافذ رہا ہے اور اس کے اردو انگریزی ترجمے بھی شائع ہوچکے ہیں۔

(۲) اردن کا جدید دیوانی اسلامی قانون۔ جو حال ہی میں علمائے کی ایک جماعت نے مرتب کیا ہے، یہ پورا قانون دو جلدوں میں ہے، اس کی زبان عربی ہے، لیکن اس کا فوری ترجمہ بھی کوئی مشکل نہیں ہے۔

(۳) مصر میں بھی حال ہی میں اسلامی قوانین کا ایک مدون مجموعہ وہاں کے علماء کی ایک جماعت نے تیار کیا ہے جو دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے قوانین پر مشتمل ہے۔ ہمارے ملک میں چونکہ "حدود آرڈیننس" کی حد تک اسلام کے بیشتر فوجداری قوانین نافذ العمل ہیں، اور "قصاص و دیت" کا موسودہ بھی تیار ہے، اس لئے فوجداری قوانین کی حد تک اس مجموعے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن دیوانی قوانین میں یہ مجموعہ بھی کارآمد ہوسکتا ہے، اور اس کا فوری ترجمہ کرالینا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔

(۴) عدالتوں کی مدد کے لئے کم از کم ہر ضلع کی سطح پر ایسے مفتیوں کا تقرر کیا جائے جو فقہ اسلامی پر اچھا عبور رکھتے ہوں، اور مختلف مقدمات میں شرعی حکم فقہ اسلامی کے اصول ماخذ سے تلاش کرکے عدالتوں کو بتاسکیں۔

(۵) آئندہ کے لئے اسلامی قانون کے ماہر قاضی تیار کرنے کے لئے ایل، ایل، بی کے نصاب میں انقلابی تبدیلیاں کرنے کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں قضاء شرعی کی تعلیم و تربیت کا مستقلاً مناسب انتظام کیا جائے۔

(۶) موجودہ جج صاحبان کے لئے ایسے ریفرشر کورس مرتب کئے جائیں جن میں متفرق لیکچروں کے بجائے خاص طور پر "مجلۃ الاحکام العدلیۃ" اور اردن اور مصر کے مدون شدہ مجموعوں کو درساً پڑھایا جائے۔

(۷) ان تمام اقدامات کے باوجود مختلف عدالتوں کے فیصلوں میں باہم اختلاف ہوگا، لیکن اس قسم کے اختلافات مدون قانون کی صورت میں اب بھی ہوتے ہیں اور ان کا حل اس طرح ہوتا ہے کہ عدالت ہائے عالیہ قانون کی کوئی ایک تعبیر متعین کر دیتی ہیں، اس کے بعد تمام عدالتیں اسی کو اختیار کرتی ہیں۔
یہی طریقِ کار اب بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے لئے عدالت ہائے عالیہ میں ایسے فقہاء کا

عدالت ہائے عالیہ کی حد تک ایسے لوگوں کا دستیاب ہونا اتنا مشکل نہیں ہوگا۔

(۸) شخصی قوانین (نکاح و طلاق، وراثت وغیرہ) کے سلسلے میں بھی جو چند مدون شدہ قوانین رائج ہیں ان کو منسوخ کر کے عدالتوں کو اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ ہر مذہب اور ہر مسلم اسلامی مکتبِ فکر کا فیصلہ اسی مکتبِ فکر کے شخصی قانون کے تحت کریں گی۔

(۹) جس دائرے میں غیر مدون قانون پر مذکورہ بالا طریق کار کے تحت عمل ہوگا، اس میں جوں جوں اسلامی قانون مدون ہوتا جائے، اسے بطور قانون موضوعہ (Statute Law) نافذ کیا جاتا رہے لیکن اس تدوین کے طریق کار میں بھی چند اہم باتوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہوگا، جن سے ان خرابیوں کا ازالہ ہوسکے جو نفاذِ شریعت کے دوسرے طریقِ کار کے تحت ہم نے پیچھے بیان کی ہیں۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے، اور انشاء اللہ اس پر آئندہ صحبت میں قدرے تفصیل سے اپنی گذارشات پیش کریں گے۔

یہ ہیں ہماری نظر میں ملک میں "نفاذ شریعت" کے طریق کار کے خطوط جنھیں انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، عمل کے وقت ان کی تفصیلات طے کی جاسکتی ہیں۔

لیکن آخر میں یہ بات ہم پھر دہرانا چاہتے ہیں کہ جو طریقِ کار اوپر بیان کیا گیا ہے وہ اسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب اس کی ایک ایک جزوی تفصیل کو اتنی ہی اہمیت، اخلاص اور توجہ سے اختیار کیا جائے جس کی وہ مستحق ہے محض ایک بل پاس کر کے بیٹھ جانے سے کبھی مقصد حاصل نہیں ہوگا بلکہ اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کچھ عرصہ تک لگاتار جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔

اس کے باوجود عبوری دور میں کچھ عملی مشکلات ضرور پیش آئیں گی، اور حصول انصاف میں کسی قدر پیچیدگی اور تاخیر اس عبوری دور میں بھی جاری رہ سکتی ہے، لیکن آج بھی ہمارا نظامِ انصاف رسانی عوام کے لئے سخت دشوار ہے، زیادہ سے زیادہ اتنی ہی دشواریاں اس عبوری دور میں بھی باقی رہ سکتی ہیں، لیکن کسی نظام کی تبدیلی کے لئے اتنی دشواریاں لازمی ہیں۔

چنانچہ عوام کو بھی اس بات کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ اس عارضی مدت میں انہیں بھی کچھ قربانیاں دینی ہوں گی، عدالتیں غلطیاں بھی کریں گی، مقدمات میں تاخیر کا سلسلہ بھی کچھ عرصہ جاری رہے گا لیکن اگر متواتر جدوجہد جاری رہی تو انشاء اللہ یہ ساری عبوری مشکلات ختم ہوں گی، اور بالآخر قوم نفاذِ شریعت کی برکات سے مستفید ہوکر رہے گی۔

لہٰذا یہ سمجھنا یا سمجھانا حقیقت پسندی سے دور ہوگا کہ جس دن "شریعت بل" کا نفاذ عمل میں آئے گا اس کے اگلے ہی دن سے نظام عدل و انصاف کی تمام مشکلات یک لخت ختم ہوجائیں گی اور عوام کے تمام مسائل فوراً حل ہوجائیں گے۔ حقیقت میں اس نظام کو جمتے بیٹھتے وقت لگے گا، اور اس درمیانی مدت کی مشکلات کو دلیل بناکر نفاذِ شریعت کے خلاف پروپیگنڈے کی کوشش بھی کی جائے گی، لیکن دراصل یہ

مشکلات "نفاذِ شریعت" کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس غلط نظامِ قانون کی وجہ سے ہوں گی جو اس وقت ہمارے معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے، اس سالہا سال جمے ہوئے نظام کو اکھاڑنے سے اسی قسم کی تکلیف ہوگی جیسے ایک شراب کے عادی کو شراب چھوڑنے سے ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ اس تکلیف سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ شراب کو چھوڑنا مضر ہے، حقیقت میں مضرت تو شراب میں ہے، اور یہ مضرت جاتے جاتے بھی اپنا زور دکھاتی ہے، لیکن عبوری مدت میں اس زور کی مضرت کو صبر و سکون سے برداشت کرلیا جائے تو آگے چل کر یہ تکلیف صحت و سکون کا پیغام لاتی ہے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے، وہ "شریعت بل" کی اصولی فکر کی تائید و حمایت اور اس کے عملی مسائل کے حل سے متعلق تھا، اس بل کا شق وار جائزہ اور اس پر تبصرہ یہاں پیشِ نظر نہیں ہے لیکن جو اصولی طریق کار عرض کیا گیا ہے، اس کے پیشِ نظر بل کا شق وار جائزہ لے کر اس میں مناسب ترمیم و اصلاح یا اس کی نوک پلک سنوارنے کا دروازہ بہرحال کھلا ہوا ہے۔

اس وقت اپنی گذارشات کو یہیں پر ختم کرتا ہوں انشاء اللہ زندگی نے فرصت دی تو اگلی صحبت میں "تدوینِ قانون" کے عملی مسائل کے متعلق اپنی گذارشات قدرے تفصیل سے پیش کرونگا۔ وما علینا الا البلاغ۔

محمد تقی عثمانی ۲۲ شوال ۱۴۰۶ھ

ایک ضروری اعلان

ہم اپنے تمام خریدار حضرات کے بیحد ممنون ہیں کہ وہ "البلاغ" کے ممبر بن کر دین کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔

ثانیاً عرض ہے کہ کاغذ، طباعت، کتابت وغیرہ کی ہوش رُبا گرانی کی وجہ سے ہم محرم ۱۴۰۷ھ سے "البلاغ" کے سالانہ چندہ میں صرف دس روپے اضافہ کرتے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ اب محرم ۱۴۰۷ھ سے سالانہ چندہ -/۵۰ روپے ہوگا۔ قارئین سے ہمیں قوی توقع ہے کہ وہ اس معمولی سے اضافہ سے کو قبول فرما کر حسبِ سابقہ اپنی خریداری جاری رکھیں گے۔

ثالثاً تمام ممبر حضرات کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اُن کی مدتِ خریداری ماہِ ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ کے شمارے پر ختم ہو رہی ہے، براہِ کرم ۱۴۰۷ھ کا سالانہ چندہ مبلغ -/۵۰ روپے، ۲۵ ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ تک روانہ فرمادیں (ترسیلِ چندہ کے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا ہرگز نہ بھولیں)، ورنہ ماہِ محرم ۱۴۰۷ھ کا شمارہ بذریعہ وی۔پی آئے گا جس سے مزید سات -/۷ روپے کا بوجھ آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔

طالبِ دعا

فاروق القاسمی

ناظم "البلاغ" کراچی
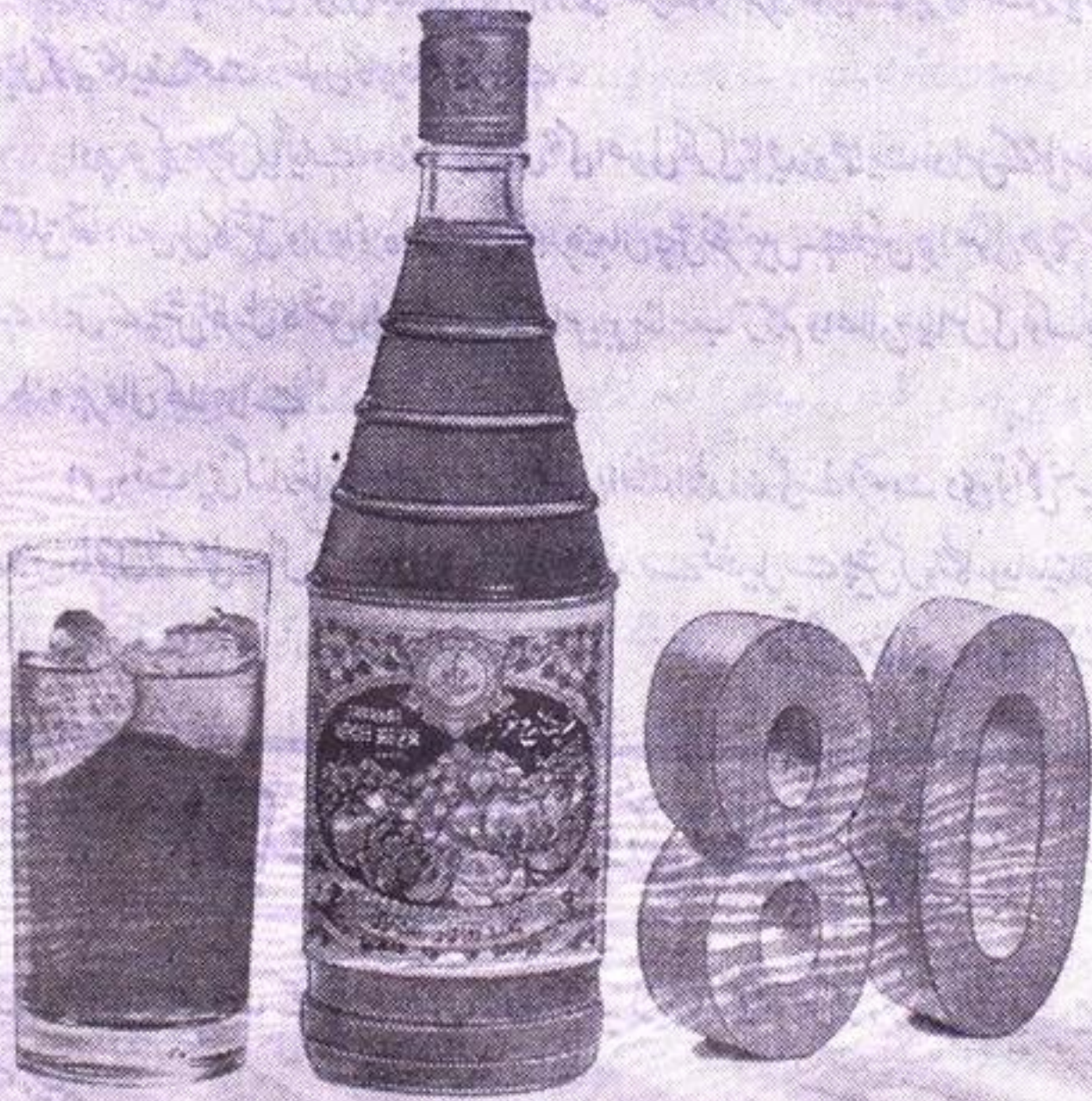
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

معارف القرآن	سورۂ ص	آیت ۲۶

خلاصۂ تفسیر

اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے، سو (جس طرح اب تک کرتے رہے ہو، اسی طرح آئندہ بھی) لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور (جس طرح اب تک کبھی نفسانی خواہش کی پیروی نہیں کی، اسی طرح آئندہ بھی) نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا کہ (اگر ایسا کرو گے تو) وہ خدا کے رستہ سے تم کو بھٹکا دے گی (اور) جو لوگ خدا کے رستہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہوگا اس وجہ سے کہ وہ روزِ حساب کو بھولے رہے۔

معارف ومسائل

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ حکومت وسلطنت بھی عطا فرمائی تھی، چنانچہ اس آیت میں حکومت وسیاست کے لئے آپ کو ایک بنیادی ہدایت نامہ عطا کر دیا گیا ہے۔ اس ہدایت نامہ میں تین بنیادی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

(١) ہم نے آپ کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔
(٢) اس حیثیت سے آپ کا بنیادی کام حق کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔
(٣) اور اس کام کے لئے خواہشات نفسانی کی پیروی سے بچنا ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

جہاں تک زمین میں خلیفہ بنانے کا تعلق ہے، اس کا مفہوم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے (دیکھئے معارف القرآن

جلد اول صفحہ ۱۲۲) اور اسی سے اسلامی سیاست کا یہ اصل الاصول واضح ہوتا ہے کہ " اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے ۔ زمین کے حکمران اسی کے احکام کے مطابق چلنے کے مجاز ہیں اس سے باہر نہیں جاسکتے ۔ لہٰذا مسلمانوں کا حاکم ، شوریٰ یا اسمبلی اسلامی قانون کی تشریح یا تدوین کرسکتی ہے ۔ لیکن درحقیقت وہ واضع قانون نہیں بلکہ اللہ کے قانون کو پیش کرنیوالے ہیں ـــــــــــــــ

اسلامی ریاست کا بنیادی کام اقامت حق ہے دوسری بات یہاں واضح کردی گئی ہے کہ اسلامی ریاست کا بنیادی کام اقامت حق ہے حکومت پر لازم ہے کہ وہ اپنے انتظامی معاملات اور تنازعات کے تصفیہ میں حق و انصاف قائم کرے ۔

اسلام چونکہ ایک ابدی دین ہے، اس لئے اس نے سیاست و حکمرانی کے لئے ایسے انتظامی جزئیات کی تعین نہیں فرمائی جو حالات اور زمانے کے بدلنے سے قابل تبدیل ہوجائیں ۔ بلکہ کچھ ایسی بنیادی ہدایات عطا فرمادی ہیں ۔ جن کی روشنی میں ہر زمانے کے مطابق انتظامی جزئیات خود طے کی جاسکتی ہیں ۔ اسی لئے یہاں یہ بات تو بتادی گئی ہے کہ حکومت کا اصل کام اقامتِ حق ہے ۔ لیکن اس کی انتظامی تفصیلات ہر دور کے اہل رائے مسلمانوں پر چھوڑی گئی ہیں ۔ ـــــــــــــــ

عدلیہ اور انتظامیہ کا رشتہ چنانچہ یہ بات کہ عدلیہ انتظامیہ سے بالکل الگ ہے یا اس کے ساتھ وابستہ ؟ اس مسئلہ میں کوئی ایسا متعین حکم نہیں دیا گیا ۔ جو ہر دور میں ناقابل تبدیل ہو ۔ اگر کسی زمانہ میں حکمرانوں کی امانت و دیانت پر پورا اعتماد کیا جاسکتا ہو تو عدلیہ اور انتظامیہ کی دوئی کو مٹایا جاسکتا ہے اور اگر کسی دور میں حکمرانوں کی امانت و دیانت پر پورا بھروسہ نہ ہو تو عدلیہ کو انتظامیہ سے بالکل آزاد بھی رکھا جاسکتا ہے ۔

حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے ۔ ان سے زیادہ امانت و دیانت کا کون دعویٰ کرسکتا تھا ؟ اس لئے انہیں بیک وقت انتظامیہ اور عدلیہ دونوں کا سربراہ بناکر تنازعات کے فیصلے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی ۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ خلفاء راشدین میں بھی یہی طرز رہا کہ امیر المؤمنین خود ہی قاضی بھی ہوتا تھا ۔ بعد کی اسلامی حکومتوں میں اس طریقے کو بدلا گیا اور امیر المؤمنین کو انتظامیہ کا اور قاضی القضاۃ کو عدلیہ کا سربراہ بنایا گیا ۔ ـــــــــــــــ

تیسری ہدایت جس پر اس آیت میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کی پیروی مت کرو ، اور روزِ حساب کو ہر وقت پیش نظر رکھو ۔ اس ہدایت پر سب سے زیادہ زور اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ چیز اقامتِ حق کی بنیاد ہے جس حاکم یا قاضی کے دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر ہے وہی صحیح معنی میں حق و انصاف قائم کرسکتا ہے ۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو آپ اچھے سے اچھا قانون بنالیجئے ۔ نفسِ انسانی کی دسیسہ کاریاں ہر جگہ اپنا راستہ خود بنالیتی ہیں ، اور ان کی موجودگی میں کوئی بہتر سے بہتر نظام قانون بھی حق و انصاف قائم نہیں کرسکتا ۔ دنیا کی تاریخ اور موجودہ زمانے کے حالات اس پر گواہ ہیں ۔

ذمہ داری کے عہدوں میں سب سے پہلے دیکھنے کی چیز انسان کا کردار ہے یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کسی شخص کو حاکم ، قاضی یا کسی محکمے کا افسر بنانے کے لئے سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر ہے یا نہیں اور اس کے اخلاق و کردار کی کیا حالت ہے ؟ اگر یہ محسوس ہو کہ اس کے دل پر خوف خدا کے بجائے خواہشاتِ نفسانی کی حکمرانی ہے تو خواہ وہ کیسی اعلیٰ ڈگریاں رکھتا ہو اور اپنے فن میں کتنا ہی ماہر اور پختہ کار ہو ۔ اسلام کی نظر میں وہ کسی اونچے منصب کا مستحق نہیں ۔ ـــــــــــــــ

حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ
ناظم مجلس علمی۔ کراچی

رزق و مال

قرآن حکیم کی روشنی میں

زیر نظر مضمون کا مقصد کچھ اُن تصورات اور زاویہ ہائے نگاہ کو پیش کرنا اور سامنے لانا ہے، جو رزق و مال کے متعلق قرآن مجید میں ملتے اور دکھائی دیتے ہیں تاکہ مسلمانوں کو اپنے اُس غلط رویے اور طرز فکر کی درستگی کا موقع ملے جو رزق و مال کے متعلق عام طور پر اُن کے اندر محسوس کیا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ بہت سی مختلف قسم کی معاشی اور معاشرتی بُرائیوں میں مُبتلا ہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ایک انسان اپنی طبعی عمر تک امن و اطمینان کے ساتھ زندہ رہنے، اپنے متعلقہ فرائض و واجبات ٹھیک طریقہ پر انجام دینے اور اپنے مراحلِ ارتقاء خیر و خوبی کے ساتھ طے کرنے کیلئے جن مادی و روحانی چیزوں کا محتاج و ضرورتمند ہے ان میں ایک نہایت نمایاں چیز رزق و مال ہے۔

قرآن حکیم چونکہ یہ چاہتا ہے کہ ہر انسان کو اپنی طبعی عمر تک سکون و اطمینان کے ساتھ زندہ رہنے، اپنے متعلقہ فرائض و وظائف خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا موقع ملے لہٰذا قرآن حکیم کی نظر میں رزق و مال کی جو ضرورت و اہمیت ہو سکتی ہے وہ کسی بیان اور دلیل کی محتاج نہیں، ظاہر ہے کہ انسان کے بعض جبلّی و طبعی تقاضے جن کے پورے ہوئے بغیر انسان سکون و اطمینان کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا جیسے غذا کا تقاضا، لباس کا تقاضا، جائے رہائش کا تقاضا، رزق و مال ہی کے ذریعے پورے ہوتے ہیں، اسی طرح ایک انسان پر اُس کی مختلف حیثیات کی وجہ سے جو دینی، معاشرتی، معاشی، سیاسی فرائض و واجبات عائد ہوتے ہیں اور جن کی صحیح ادائیگی پر معاشرے کے قیام و بقا اور فرد کی فلاح و بہبود کا دارومدار ہوتا ہے رزق و مال کے بغیر ٹھیک طریقہ سے ادا نہیں کئے جا سکتے

زرمائی حسانات اور صدقہ وخیرات کے ذریعے فرد کو جو اخلاقی و روحانی ارتقا نصیب ہوتا ہے رزق و مال کے بغیر وہ کیسے ممکن ہے۔

رزق و مال کی انسان کے لئے بلحاظ حقیقت واقعہ اور نفس الامر جو ضرورت اور اہمیت ہے قرآن حکیم اُسے تسلیم کرتا اور رزق و مال سے متعلق اپنی معاشی تعلیمات میں اس کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے لگایئے کہ قرآن مجید کی متفرق آیات میں ایک سو بائیس مرتبہ رزق کا اور چھیاسی مرتبہ مال کا ذکر کیا گیا ہے، اسی طرح تقریباً تیئیس مقامات پر رزق و مال کو لفظ فضل سے اور پانچ جگہ لفظ خیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا اس مضمون میں اصل مقصد اُن افکار و تصورات کو بیان کرنے کی کوشش کرنا ہے جو رزق و مال کے مختلف پہلوؤں سے متعلق قرآن مجید میں ذکر ہوئے ہیں لیکن اصل مقصد سے پہلے مناسب و مفید سمجھتا ہوں کہ کچھ وہ بھی عرض کردوں جو رزق اور مال کے معنے و مفہوم کے بارے میں مختلف علماء کرام نے لکھا ہے: پہلے لفظ رزق کو لیجئے علماء لغت میں سے علامہ فیروز آبادی نے قاموس المحیط میں لکھا ہے[1]:

"الرزق ما ینتفع بہ": رزق وہ چیز ہے جس سے نفع اٹھایا اور فائدہ حاصل کیا جائے۔ کتاب مذکور کی شرح "تاج العروس" میں علامہ الزبیدی نے یہ بھی لکھا ہے: "قیل الرزق ھو ما یسوقہ اللہ تعالٰی الی الحیوان للتغذی ای ما بہ قوام الجسم و نماؤہ" [2] رزق وہ شے ہے جو اللہ تعالٰی بہم پہنچاتا ہے حیوان کو غذا کیلئے یعنی وہ چیز جس سے جسم کو سہارا اور نشوونما ملتا ہے۔

لسان العرب لابن منظور اور الصحاح للجوہری میں بھی رزق کے معنے "ما ینتفع بہ" لکھے ہیں[3] یعنی ہر وہ چیز جس سے نفع حاصل کیا جائے، علامہ راغب اصبہانی نے اپنی جلیل القدر کتاب المفردات فی غریب القرآن میں رزق کی تشریح میں لکھا ہے: "الرزق یقال للعطاء الجاری تارۃً دنیویاً کان او اخرویاً، وللنصیب تارۃً، ولما یصل الی الجوف ویتغذی بہ تارۃً۔" [4] رزق کبھی اُس عطیے کو کہا جاتا ہے جو کسی کے لئے مقدر اور جاری ہو خواہ دُنیوی ہو یا اُخروی، کبھی نصیب اور حصے کو کہا جاتا ہے اور کبھی اُس غذائی شئے کو کہا جاتا ہے جو پیٹ میں پہنچتی اور سبب غذا بنتی ہے، پھر کچھ آگے لکھا ہے: "قیل عنی بہ الاغذیۃ ویمکن ان یحمل علی العموم فیما یوکل ویلبس ویستعمل وکل ذٰلک مما یخرج من الارض": اور کہا گیا ہے کہ رزق سے مراد غذائی اشیاء ہیں اور یہ بھی ممکن ہے اس سے مراد وہ عام اشیاء ہوں جو کھانے پینے پہننے پوشنے اور دیگر استعمال میں آتی ہیں اور زمین سے نکلنے والی تمام چیزیں۔

کشاف اصطلاحات الفنون میں علامہ محمد اعلیٰ تمہانوی نے رزق کی چند تعریفات نقل فرمائی ہیں[5]

---

[1] ص ٢٣٥۔ ج ٣۔ القاموس المحیط۔ [2] ص ٣٥٥۔ ج ٦۔ تاج العروس۔ [3] ص ٣٠٥۔ ج ١١۔ لسان العرب۔ [4] ص ١٩٣۔ المفردات الراغب۔ (٥) ص ٥٨١۔ ج ١۔ کشاف اصطلاحات الفنون۔

اول: "الرزق ما يتربّى به الحيوانات من الاغذية والاشربة" - رزق کھانے پینے کی وہ اشیاء ہیں جن کے ذریعے حیوانات پلتے اور پرورش پاتے ہیں۔ دوم: "الرزق هو ما يسوقه الله تعالى الى الحيوان فيأكله" رزق ہر وہ شے ہے جو اللہ تعالیٰ حیوان کو بہم پہنچائے پس وہ اُسے کھاتا ہے۔ سوم جو اشاعرہ متکلمین کے حوالہ سے ہے: "الرزق ما ساقه الله تعالى الى الحيوان فانتفع به بالتغذي او غيره مباحاً كان او حراماً" رزق وہ شے ہے جو اللہ تعالیٰ حیوان کو بہم پہنچاتا اور حیوان کھانے پینے وغیرہ کے ذریعے اُس سے فائدہ اٹھاتا ہے خواہ وہ شے مباح ہو یا حرام۔ چہارم جو معتزلہ کی طرف منسوب کی گئی ہے: "الرزق ما لا يمتنع شرعاً الانتفاع به" رزق وہ چیز ہے جس سے نفع اٹھانا شرعاً ممنوع نہ ہو۔

سید الشریف علی الجرجانی نے اپنی کتاب التعریفات میں رزق کی تعریف ان الفاظ سے لکھی ہے:
"الرزق ما يسوقه الله تعالى الى الحيوان فيأكله فيكون متناولاً للحلال والحرام"[ے] رزق نام ہے ہر اُس شے کا جس کو اللہ تعالیٰ حیوان تک پہنچائے پس وہ اسے کھاتا ہے چنانچہ اس میں حلال اور حرام دونوں شامل ہیں۔

علامہ ابوالبقاء نے اپنی مشہور کتاب الکلیات میں رزق کے متعلق لکھا ہے: "الرزق هو يقال للعطاء الجاري دنيوياً كان او دينياً، وللنصيب، ولما يصل الى الجوف ويتغذى به"[ٹ] رزق اُس عطیے کو بھی کہا جاتا ہے جو مقرر ہو خواہ وہ دنیوی ہو یا دینی، اور نصیب و حصے کو بھی کہا جاتا ہے اور اُس چیز کو بھی جو حیوان و جانور کے پیٹ میں پہنچتی اور سبب غذا بنتی ہے۔

علامہ ابن خلدون نے مقدمۂ تاریخ میں رزق کے متعلق ایک خاص بات یہ بھی لکھی ہے[ٹ] کہ انسان کی صرف وہی اشیاء اُس کا رزق کہلا سکتی ہیں جو اُس کے ذاتی صرف و استعمال میں آجاتی اور جن سے وہ فائدہ اٹھا لیتا ہے، چنانچہ مرنے والا جو نفع بخش اشیاء اپنے پیچھے چھوڑتا ہے وہ اس کی نسبت سے رزق نہیں بلکہ اُس کے ورثاء کی نسبت سے رزق کا مصداق ہوتی ہیں جب وہ اُن کو اپنے استعمال میں لاتے اور اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

رزق سے متعلق مذکورہ بالا عبارات میں سے بعض یہ بتلاتی ہیں کہ رزق صرف کھانے پینے کی غذائی اشیاء کا نام ہے جو جاندار کے پیٹ میں پہنچتی، ہضم ہو کر جزوِ بدن بنتی اور اس کو تقویت اور نشو و نما دیتی ہیں اور بعض سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رزق کے مفہوم میں وہ تمام اشیاء داخل ہیں جن سے جاندار کی کوئی ضرورت و حاجت پوری ہوتی اور اُسے فائدہ پہنچتا ہے خواہ وہ غذائی اشیاء ہوں یا پہننے پوشنے کے لباس، رہنے سہنے کے مکان اور استعمال کے مختلف ساز و سامان ہوں ضرورت کے درجہ کے ہوں یا راحت و آسائش اور تعیش و تنعم کے درجہ کے، اسی طرح بعض تعریفوں کے مطابق رزق میں حلال اور حرام دونوں قسم کی چیزیں

ے ص ۹۷۔ التعریفات للجرجانی، ٹ ص ۱۹۴۔ الکلیات لابی البقاء، ٹ ص ۳۰۹۔ المقدمہ لابن خلدون۔

داخل ہیں اور بعض کے مطابق صرف وہی چیزیں جو شرعاً مباح و حلال ہیں۔

رزق کی طرح مال کی بھی مختلف کتابوں میں مختلف و متعدد تعریفیں لکھی گئی ہیں مثلاً لغت کی بڑی کتابوں جیسے لسان العرب[9] اور تاج العروس[10] میں مال کی تعریف یہ کہ: "المال ما ملکته من کل شیئ" مال ہر وہ شے ہے جس کا تو مالک اور جو تیری ملکیت میں ہو۔ کشاف اصطلاحات الفنون میں فقہائے کے حوالے سے مال کی تعریف یہ کی گئی ہے: "المال ما یمیل الیه الطبع و یجری فیه البذل والمنع:"[11] مال وہ ہے جس کی طرف طبیعت مائل ہوتی اور جو خرچ کیا اور بچایا جا سکتا ہو۔ ایک اور تعریف جو کتاب مذکور میں جامع الرموز کے حوالہ سے لکھی گئی ہے یہ کہ: "المال ما ید خر عند الحاجة"[12] مال وہ ہے جو بوقت حاجت ذخیرہ کیا جا سکتا ہو۔

کتاب دستور العلماء میں مال کی تعریف اِن الفاظ سے کی گئی ہے: المال من شانه ان یدخر للانتفاع به وقت الحاجة۔[13] مال کی شان اور صفت یہ ہے جسے ضرورت کے وقت فائدہ اٹھانے کے لئے ذخیرہ کیا جا سکتا ہو۔

بعض کتابوں میں مال کی چند اور تعریفیں بھی نقل کی گئی ہیں[14]: مثلاً "المال کل یتملکه الانسان": مال ہر وہ چیز ہے جسے انسان اپنی ملکیت میں لیتا ہے۔ دوم: "المال کل ما یمکن حیازته والانتفاع به علی وجه المعتاد۔" مال ہر وہ شے ہے جس کا جمع و محفوظ کرنا اور جس سے معتاد طریقہ پر فائدہ اٹھانا ممکن ہو۔ سوم: "المال کل ما یرغب الناس فی اقتنائه و امتلاکه من الاشیاء" مال وہ تمام اشیاء ہیں جن کو ذخیرہ اور جمع کرنے اور اپنی ملکیت میں لینے کی لوگوں کے اندر رغبت و چاہت پائی جاتی ہے۔ چہارم: "المال شیئ ینتفع به نوع الانسان و یحتاج الیه": مال وہ شے ہے جس سے نوع انسان فائدہ اٹھاتی اور جس کی طرف محتاج ہوتی ہے۔

مال کے متعلق مذکورہ عبارات و تعریفات سے واضح ہوتا ہے کہ مال کا مصداق ایسی تمام اشیاء ہیں جو اپنے اندر انسان کے لئے کوئی منفعت اور اس کی کسی حاجت و ضرورت کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور جن کو انسان اپنے لئے محفوظ اور ذخیرہ کرنا اور اپنی ملکیت میں لینے کی خواہش رکھتا ہے، گویا مال کیلئے تین اوصاف کا ہونا ضروری ہے ایک منفعت بخش ہونا، دوم قابل ذخیرہ ہونا اور سوم قابل ملکیت یا کسی کی ملکیت میں ہونا۔

رزق اور مال کے لغوی اور اصطلاحی معنے و مفہوم کی وضاحت کے بعد اب میں اصل مقصد کی طرف آتا ہوں یعنی یہ کہ رزق اور مال کے متعلق قرآن مجید میں جو افکار و تصورات ہیں وہ کیا ہیں؟

اس سلسلہ میں قرآن مجید کے مطالعہ سے جو پہلی حقیقت ابھر اور نکھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ کائنات

---

[9] ص ۱۵۸۔ ج ۱۴۔ لسان العرب۔ [10] ص ۱۳۱۔ ج ۸۔ تاج العروس۔ [11] ص ۱۳۵۱۔ ج ۲۔ کشاف اصطلاحات الفنون [12] ص ۱۳۵۱۔ ج ۲۔ کشاف، [13] ص ۱۸۸، ج ۳۔ دستور العلماء۔

عالم میں رزق کا جو عجیب و غریب نظام و انتظام ہے جسے ہر انسان دیکھتا اور محسوس کرتا ہے یہ نظام و انتظام اللہ رب العزت کی طرف سے ہے جو ہر شے اور ہر جاندار کا رب اور رزاق ہے اُس کی صفت ربوبیت اور رزاقیت کا تقاضا ہے کہ کائنات میں وہ سب کچھ موجود ہو جس سے ہر جاندار کو رزق اور سامان پرورش و نشو و نما مل سکتا ہو، اور یہ کہ اللہ رب العلمین کا منشا یہ ہے کہ کوئی جاندار اور کوئی انسان اپنی زندگی میں رزق و روزی سے محروم نہ رہے۔

جن قرآنی آیات سے مذکورہ حقیقت منکشف ہوتی ہے وہ کثیر التعداد ہیں اُن میں سے بطور مثال چند آیات ملاحظہ فرمائیے: سورۂ بقرہ کے تیسرے رکوع کی ابتدائی آیات ہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ ۲۱

اے انسانوں عبادت کرو تم اپنے اُس رب و پروردگار کی جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی بن جاؤ، اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے زمین کو تمہارے لئے فرش بنایا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا پس نکالے اور اُگائے اس کے ذریعے طرح طرح کے پھل اور غلے تمہارے رزق کیلئے

آگے سورۂ ابراہیم میں بھی ایک آیت کے بعینہٖ یہی کلمات ہیں: وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ - اور اللہ نے آسمان سے بارش برسائی پس اس کے ذریعے مختلف قسم کے پھل میوے پیدا کئے تمہارے رزق کیلئے۔

سورۂ یونس کی آیت ہے:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ - آیت ۳۱

ان سے پوچھیئے کہ وہ کون ہے جو تمہیں آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے؟ کہہ دیجئے وہ صرف اللہ ہے۔

سورۂ ہود کی آیت ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ۔ ۶

اور نہیں ہے زمین میں رینگنے چلنے والا کوئی جانور مگر اللہ کے ذمہ ہے اس کا رزق۔

سورۂ العنکبوت کی آیت ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۔ ۶۰

اور کتنے ہی ہیں زمین میں رینگنے والے جانور جو نہیں اُٹھائے رکھتے اپنا رزق، اللہ ہی انکو بھی رزق دیتا ہے اور تم کو بھی۔

یہ چند آیات بطور مثال ہیں ورنہ قرآن مجید میں کثرت سے ایسی آیات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات

یہی تو وہ رزق کا جو عجیب و غریب نظام ہے اللہ رب العلمین اور رزاق کل کی جانب سے ہے اور یہ یہ کہ وہ سب جانداروں اور تمام انسانوں کے انتفاع و استفادہ کے لئے ہے، قرآن مجید میں اسی سے زیادہ مقامات پر ایسے کلمات ہیں جن میں صراحت کے ساتھ رزق دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقیت پر دلالت کرتے ہیں، تیرہ مقامات پر رَزَقْنٰهُمْ، سات مقامات پر رَزَقْنٰكُمْ، نو جگہ رَزَقَكُمُ اللّٰهُ، چار جگہ رَزَقَهُمُ اللّٰهُ، پانچ مقامات پر يَرْزُقُكُمْ، چار مقامات پر يَرْزُقُ، ایک مقام پر تَرْزُقُ، تین جگہ نَرْزُقُ، ایک جگہ يَرْزُقُهٗ، ایک جگہ يُرْزَقُهَا، ایک مقام پر رَزَقْنٰهُ، ایک جگہ اُرْزُقْنِيْ، ایک جگہ اُرْزُقْنَا، ایک جگہ اُرْزُقْهُمْ، کلمات مذکور ماضی، مضارع اور امر کی صورت میں فعلی صیغے ہیں اور سب میں فاعل اللہ تعالیٰ ہے، اسی طرح نو مقامات پر يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ، ایک مقام پر بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ، ایک جگہ اَخْرَجَ مِنْ رِزْقٍ، ایک جگہ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ رِّزْقٍ، ایک مقام پر وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ، ایک مقام پر عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقُ، پانچ مقامات پر وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ ایک مقام پر ہے اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ،

اسی طرح قرآن مجید کی وہ سینکڑوں آیات جن میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کا بیان ہے اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقیت پر بھی دلالت کرتی ہیں اس لئے کہ رزاقیت، ربوبیت کا جزو اور لازمی حصہ ہے ظاہر ہے کہ کسی جاندار کی پرورش و نشوونما، رزق کے بغیر نہیں ہو سکتی لہٰذا رب و پروردگار کے لئے لازمی ہے کہ وہ رزق دینے والا رازق ہو، بہرحال اس قسم کی قرآنی آیات جن میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ اور رزاقیت شاملہ کا ذکر ہے قرآن مجید پر ایمان رکھنے والوں سے یہ تقاضا کرتی ہیں کہ وہ دنیا میں ایک ایسا معاشی نظام قائم کرنے کی پوری کوشش کریں جس میں ہر فرد انسان کو رزق یعنی کسی نہ کسی شکل میں اتنا سامان معاش ضرور میسر ہو جس کے بغیر عام طور پر ایک انسان نہ اطمینان کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے اور نہ اپنے متعلقہ فرائض و واجبات ٹھیک طور پر انجام دے سکتا ہے جن کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی پر معاشرے کے قیام و بقا اور اجتماعی فلاح و بہبود کا دار و مدار ہوتا ہے۔

بالفاظ دیگر جس معاشی نظام میں معاشرے کے ہر فرد کے لئے رزق اور بنیادی معاشی ضروریات کا انتظام نہ ہو ایسا معاشی نظام قرآن حکیم کی رُو سے غلط معاشی نظام قرار پاتا ہے اور اُسے اسلامی معاشی نظام نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ قرآن مجید کی روشنی میں، معاشرے کے ہر ہر فرد کے لئے رزق اور بنیادی معاشی ضروریات کے انتظام کا مطلب ہے جو افراد قدرتی وسائل رزق سے رزق حاصل کر سکنے کی صلاحیت اور قدرت رکھتے ہوں اُن کے لئے اس کا موقع مہیا ہو کہ وہ جدوجہد کر کے رزق و مال حاصل کر سکیں، اور جو کسی عذر کی وجہ سے معاشی جدوجہد کی صلاحیت و قدرت نہ رکھتے ہوں مثلاً بچپنے، بڑھاپے اور بیماری وغیرہ کی وجہ سے معذور ہوں اُن کے لئے معاشرے کے دوسرے ایسے افراد کی طرف سے رزق مہیا ہونا ضروری ہے جو غنی و مالدار ہوں خواہ ان کے اعزہ و اقارب ہوں یا غیر، اگر قومی بیت المال موجود ہو تو وہ اُن کی کفالت کرے، بہرحال ایک اسلامی معاشرے میں کوئی فرد رزق اور بنیادی معاشی ضروریات سے محروم نہیں رہنا چاہیئے۔

یہاں تک جو گفتگو تھی رزق سے متعلق تھی اَب مال کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہے، قرآن مجید میں مال کا بھی تقریباً چھیاسی مرتبہ ذکر ہے لیکن مال کے ذکر کا اسلوب رزق کے ذکر کے اسلوب سے کچھ مختلف ہے رزق کے ذکر میں جیساکہ آپ نے اوپر دیکھا اس کو نسبت اور اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے جبکہ مال کے ذکر میں عموماً اس کی نسبت و اضافت انسانوں کی طرف ہے تقریباً ستر جگہ مال کی اضافت انسانوں کی طرف ہے، اکتیس جگہ مال کی اضافت ضمیر جمع مذکر غائب کی طرف بصورت اَمْوَالُهُمْ، چودہ جگہ ضمیر جمع مذکر مخاطب کی طرف بصورت اَمْوَالُكُمْ چھ جگہ اس کی اضافت ضمیر واحد مذکر غائب کی طرف بشکل مَالُهٗ، دو جگہ ضمیر جمع متکلم کے ساتھ بشکل اَمْوَالُنَا، ایک جگہ ضمیر واحد متکلم کے ساتھ بصورت مَالِيَه، چار مقامات پر اَمْوَالُ النَّاسِ، دو مقامات پر مَالُ الْيَتِيْمِ، ایک جگہ اَمْوَالُ الْيَتَامٰى کی صورت میں، ایک جگہ بصورت ذَا مَالٍ، ایک جگہ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا کی صورت میں، ایک جگہ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا، ایک جگہ كَانُوْٓا اَكْثَرَ اَمْوَالًا، اور ایک جگہ نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا کی صورت میں ہے۔

صرف ایک جگہ مال کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور وہ سورۃ النور کی اس آیت میں:

وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ۔ اور دو اُن کو اللہ کے اس مال سے جو اس نے تمہیں دیا۔

نیز تین جگہ مال دینے اور تین جگہ مالی مدد دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، مال دینے کی نسبت ایک تو آیت مذکور ہیں، دوم سورۂ یونس کی اس آیت میں:

رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا۔ ہمارے رب آپ نے فرعون اور اس کے درباریوں کو سامان زینت اور اموال دیئے ہیں۔

سوم سورۃ المدثر کی اس آیت میں:

وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا۔ اور ہم نے اس کے لئے کیا مال پھیلا ہوا یعنی زیادہ، اور امداد مال کی نسبت ایک اس آیت میں: وَنُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ، دوسری اس آیت میں: وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ، اور تیسری اس آیت میں: وَيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ۔ اور وہ تمہاری امداد کریگا اموال و اولاد سے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں رزق اور مال کے بیان میں جو دو مذکورہ بالا مختلف اسلوب اختیار کئے گئے ہیں ان میں ہمارے لئے کیا سبق اور کیا ہدایت ہے؟

اس سوال کا جواب میرے علم و فہم کے مطابق یہ کہ وہ قدرتی اشیاء جن سے رزق حاصل کیا جاتا اور جن پر حصول رزق کا دار و مدار ہے تمام تر صرف اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں انسانی سعی و محنت کا ان کے وجود میں کوئی دخل نہیں، مثلاً وہ غلہ جو کھیت سے پیدا ہوتا اور انسانوں کے لئے رزق بنتا ہے کاشتکار کی سعی و محنت سے ہرگز پیدا نہیں ہوتا بلکہ کاشتکار کی سعی و محنت صرف اس کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے غلہ جن چیزوں سے پیدا ہوتا ہے وہ بیج، زمین کی مٹی اور اس میں موجود قوتِ نمو، پانی، ہوا، روشنی، حرارت، موسمی اثرات وغیرہ ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں صرف اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں انسانی سعی و محنت کا ان کے وجود سے کوئی تعلق نہیں، انسان کسی بڑی شئے کو تو کیا ایک ذرے تک کو پیدا نہیں کر سکتا، ایک انسان جو کچھ کرتا اور کر سکتا ہے

وہ صرف یہ کہ عملِ ترکیب وتحلیل کے ذریعے قدرتی اشیاء کی ہیئتوں اور شکلوں میں ردّو بدل کرتا اور ان کو ایسی شکلیں دیتا ہے جو اس کے مفید مطلب ہوتی ہیں، تو پھر جب وہ تمام قدرتی اشیاء جن سے انسان تدّتی رزق حاصل کرتا ہے خالق کائنات اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا نتیجہ ہیں نیز اُن کا بقاء و استمرار اللہ رب العٰلمین کی صفتِ ربوبیت کا مرہونِ منت ہے تو رزق کی نسبت و اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہونا حقیقت واقعہ کی سچی تعبیر ہے، اور اس میں ہمارے لئے جو ہدایت و تعلیم ہے وہ یہ کہ ہماری اس پر ہمیشہ توجہ اور برابر یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی جاندار اور کوئی انسان رزق سے محروم نہ رہے جس پر اس کی حیات و بقا اور نشوونما کا دارو مدار ہے۔

رہی مال کی نسبت و اضافت انسانوں کی طرف تو اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ کسی شے کے مال کہلانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ منفعت بخش، قابل تبادلہ، قابل ذخیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی انسان کی ملکیت میں بھی ہو جیسا کہ مال کی اُن تعریفات سے ظاہر ہوتا ہے جو پہلے عرض کی گئی ہیں، اور چونکہ کسی قدرتی شے کے کسی انسان کی ملکیت میں ہونے کا اصل اور ابتدائی سبب وہ سعی و محنت ہوتی ہے جس سے اُس شے کی قدرتی افادیت میں کچھ مزید افادیت پیدا ہوگئی ہوتی اور اُس کے ساتھ انسانی سعی و محنت کے مفید اثرات قائم ہوگئے ہوتے ہیں لہٰذا مال کی اضافت انسانوں کی طرف ہونا، عقل و فہم کے عین مطابق ہے اور اس میں مسلمانوں کے لئے یہ ہدایت ہوسکتی ہے کہ وہ مختلف اموال کے متعلق انسانی ملکیت کو تسلیم کریں اور اپنے نظام معیشت میں اس کو قائم و برقرار رکھیں اور پوری طرح اس کا تحفظ عمل میں لائیں، اموال کے متعلق انسانی ملکیت تسلیم کرنے کا مطلب یہ کہ جس انسان کی سعی و محنت سے کسی قدرتی شے کی قدرتی افادیت میں نئی افادیت کا اضافہ ہوا ہو اُس انسان کے متعلق تسلیم کیا جائے کہ اسے اُس شے سے انتفاع و استفادہ کے حق میں دوسرے انسانوں پر ترجیح و تخصیص حاصل ہے دوسرا کوئی اس کی رضامندی اور اجازت کے بغیر اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، پھر چونکہ ملکیتِ مال کے حصول کا جو سبب و ذریعہ ہے وہ سب انسانوں میں یکساں طور پر نہیں بلکہ فرق و تفاوت کے ساتھ پایا جاسکتا ہے لہٰذا کسی کے پاس مال کم اور کسی کے پاس زیادہ ہونا ایک لازمی اور قدرتی امر ہے بنابریں اسلامی معاشی نظام کے اندر اس فرق و تفاوت کو قائم رکھنا صحیح اور ضروری اور اس کو مٹانے کی کوشش کرنا غلط اور غیر فطری ہے۔

یہاں یہ بھی ضرور ملحوظ رہے کہ مال کی تعریف میں جہاں وہ اشیاء آتی ہیں جو بنیادی معاشی ضروریات کی حیثیت رکھتی ہیں وہاں وہ اشیاء بھی آتی ہیں جو راحت و آسائش، آرائش و زیبائش اور تنعم و تعیش سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کے بغیر بھی انسان اطمینان کے ساتھ زندہ رہ سکتا اور اپنے فرائض ٹھیک طور پر انجام دے سکتا ہے گویا بعض اشیاء ایسی ہیں جو بیک وقت رزق و مال دونوں کا مصداق ٹھہرتی ہیں اس لحاظ سے کہ اُن پر انسان کی حیات و بقا اور نشوونما کا دارومدار ہے رزق، اور اس لحاظ سے کہ ان کے حصول میں انسانی سعی و محنت کا دخل اور وہ کسی انسان کی ملکیت ہیں مال کہلاتی ہیں مثلاً وہ غلہ جو ایک کسان اپنے کھانے کے لئے زمین سے حاصل کرتا ہے وہ رزق اور مال دونوں کا مصداق ہوتا ہے مال کا مصداق اس لئے کہ وہ اس کی سعی و محنت کی وجہ سے اس کی ملکیت میں ہوتا ہے اور دوسرا کوئی اس کی اجازت کے بغیر اس سے منتفع و متمتع نہیں ہوسکتا، یعنی اس سے فائدہ اٹھانے کے حق میں اس کو

دوسروں پر ترجیح وتخصیص حاصل ہو گئی ہوتی ہے بوجہ اس سعی ومحنت کے جو اس نے اسکے حصول میں صرف کی تھی۔

سطور بالا میں مال اور اس کی ملکیت کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا اس کا صاف مطلب یہ کہ ہر مال کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی انسان کی ملکیت میں اور کوئی نہ کوئی انسان اس کا ضرور مالک ہو، یعنی اس مال سے انتفاع واستفادے کے حق میں ایک انسان کو دوسرے انسانوں پر ترجیح وتخصیص حاصل ہو لہٰذا کسی مال کے متعلق ایک انسان کی ملکیت، دوسرے انسانوں کی بنسبت ہوتی ہے جو اس کی طرح اس مال سے انتفاع و استفادہ کے محتاج وضرورتمند ہوتے ہیں، یہ ملکیت، اللہ تعالیٰ کی بنسبت نہیں ہوتی جو انتفاع واستفادے سے مستغنی وبے نیاز ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کوئی مال بیک وقت دو انسانوں کی مستقل ومنفرد ملکیت نہیں ہو سکتا کیونکہ جب یہ مان لیا جائے کہ اس مال سے انتفاع واستفادے کے حق میں زید کو باقی سب انسانوں پر ترجیح وتخصیص حاصل ہے تو اس سے باقی سب کے حق ترجیح وتخصیص کی نفی ہو جاتی ہے اس طرح دو انسانوں کی منفرد اور مستقل ملکیت بیک وقت ایک مال میں جمع نہیں ہو سکتی ورنہ ان کے مابین نزاع وتصادم رونما ہوتا ہے،

لیکن اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور ایک انسان کی ملکیت بیک وقت ایک مال میں جمع ہو سکتی اور ایک ہی مال بیک وقت اللہ کی ملکیت بھی ہو سکتا ہے اور ایک انسان کی ملکیت بھی، اور اس میں اس لئے کوئی تعارض واقع نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں انتفاع واستفادے کا کوئی تصور نہیں اللہ تعالیٰ کی ملکیت کے معنے ہیں اللہ تعالیٰ کو کائنات کی ہر شے میں بمعہ انسان کے، ہر قسم کے تصرف اور ردّ وبدل کا ذاتی، کلی دائمی اور مطلق اختیار ہے اس لئے کہ تنہا وُہی ہر شے کا خالق اور رب ہے لہٰذا اُس کے کسی تصرف پر کسی کو کسی اعتراض کا حق نہیں وہ اپنی پیدا کردہ مخلوق میں جو چاہے تصرف کر سکتا ہے، اور یہ کہ اس کا ہر تصرف مخلوق کی خیر وبھلائی کے لئے ہوتا ہے، جبکہ اس کے بالمقابل کسی شے کے متعلق انسان کی ملکیت مقید، عارضی اور اضافی ہوتی ہے انسان اپنی مملوکہ چیز میں جو چاہے تصرف وردّ وبدل نہیں کر سکتا صرف وہی تصرف کر سکتا ہے جو اس کے لئے مفید ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لئے مضر نہ ہو کیونکہ اس کے بعض تصرفات ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو اگرچہ اُس کے لئے مفید لیکن دوسروں کے لئے مُضر ثابت ہوتے اور شریعت اور قانون کی روسے ناجائز ٹھہرتے ہیں، اسی طرح انسان کی ملکیت دائمی نہیں عارضی اور حقیقی نہیں مجازی ہوتی ہے یعنی مالک حقیقی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اور اس کے احکام کے تابع ہوتی ہے۔

اللہ کی ملکیت اور انسان کی ملکیت کی مذکورہ تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ کسی شے کے متعلق اللہ تعالیٰ کی ملکیت کے اثبات سے انسانی ملکیت کی نفی لازم نہیں آتی دونوں ایک شے میں جمع ہو سکتی ہیں لہٰذا اُن قرآنی آیات سے جو اللہ تعالیٰ کی ملکیت پر دلالت کرتی ہیں یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں کہ انسانی ملکیت کا تصور غلط ونادرست ہے یہ استدلال اس صورت میں ضرور درست ہوتا جب اللہ کی ملکیت اور انسان کی ملکیت کے ایک ہی معنے ہوتے حالانکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا دونوں کے الگ الگ معنے ہیں اور ان کے درمیان کوئی تعارض وتناقض نہیں، بہرحال جہاں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور صفت مالکیت کا واضح بیان ہے وہاں انسانی ملکیت کا بھی کھلا ہوا ذکر اور قطعی اثبات

ہے جن آیات میں صدقہ و زکوٰۃ، قرض و انفاق فی سبیل اللہ، مہر و نفقہ، وصیت و وراثت، جزیہ، دیت بیع و شراء، ربٰو و میسر، لشر و خیانت و غیرہ سے متعلق جو مالی اور معاشی احکام ہیں اگر مال کے متعلق انسانی ملکیت نہ ہو تو پھر ان آیات و احکام کا کوئی مفہوم و مطلب ہی باقی نہیں رہتا، قرآن حکیم کا ان کو تسلیم کرنا اور ان کے متعلق ایجابی و امتناعی احکام دینا، دراصل مال کے متعلق انسانوں کی ملکیت تسلیم کرنا ہے۔

رزق و مال کے متعلق قرآن مجید کے مطالعے سے جو دوسری چیز سامنے آتی ہے وہ یہ کہ رزق و مال کوئی ایسی شے نہیں جس کو برا سمجھا اور جس سے نفرت کی جائے بلکہ ایک اچھی اور قابل رغبت شے ہے اور جس کے حصول کے لئے سعی و کوشش کرنا مستحسن اور مطلوب ہے البتہ اس سے محبت کرنا اور اسے محبوب مقصد بنانا درست نہیں۔

قرآن حکیم کی ایسی آیات جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رزق و مال فی نفسہ کوئی بری اور قابل نفرت چیز نہیں بلکہ ایک اچھی اور قابل رغبت شے ہے ایک تو وہ ہیں جن میں رزق و مال کو لفظ خَیْرٌ، فضل، اور قِیَامًا لِلنَّاسِ سے تعبیر کیا گیا ہے، پانچ آیات میں لفظ خیر سے، پچیس آیات میں لفظ فضل سے، ایک آیت میں قِیَامًا لِلنَّاسِ سے رزق و مال کا ذکر ہے، بطور مثال ان میں سے چند آیات ملاحظہ فرمایئے:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۝ (۱۸۰، البقرۃ)

تم پر واجب ٹھہرایا گیا ہے کہ جب تم میں سے ایک کی موت کا وقت آجائے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو کہ وہ والدین اور دیگر قرابت داروں کیلئے معروف طریقے سے وصیت کرے۔

قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۝ (۲۱۵، البقرۃ)

فرما دیجئے تم جو بھی مال خرچ کرنا چاہو خرچ کرو اپنے والدین، اقرباء، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ۔ (۱۰، الجمعۃ)

جب نماز جمعہ ادا ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزق تلاش کرو۔

وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ۔ (۲۰، المزمل)

اور دوسرے ہیں جو زمین میں چلتے دوڑ دھوپ کرتے اور اللہ کا فضل یعنی رزق تلاش کرتے ہیں۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا لِلنَّاسِ۔ (۵، النساء)

اور نہ دو نابالغ کم عقل یتیموں کو اپنے وہ اموال جن کو اللہ نے انسانوں کے لئے سہارا بنایا ہے۔

یہ اور اس قسم کی دوسری بکثرت آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ رزق و مال فی نفسہ ایک اچھی چیز ہے اس سے نفرت نہیں بلکہ رغبت کرنی چاہیئے کیونکہ یہ خیر اور اللہ کا فضل ہیں۔

دوسری وہ آیات قرآنی ہیں جن میں مسلمانوں کے لئے یہ ہدایت اور تاکید ہے کہ وہ حصول

رزق و مال کے لئے سعی و کوشش اور جدوجہد کریں بطور مثال ذیل میں چند آیات نقل کی جاتی ہیں:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔
(ع۱ ۱۰ الجمعہ)

پس جب نماز جمعہ پوری طرح ادا ہو جائے تو پھر زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزق تلاش کرو۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ۔
(ع۱۵ ۱ الملك)

وہ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو چلنے اور روندنے کے قابل بنایا پس تم چلو اس کے راستوں میں اور کھاؤ اس کے رزق سے۔

ان مذکورہ دونوں آیتوں میں امر کے صیغوں کے ساتھ جو عموماً وجوب پر دلالت کرتے ہیں حصول رزق کے لئے معاشی جدوجہد کا حکم فرمایا گیا ہے، پہلی آیت میں فَانْتَشِرُوْا اور وَابْتَغُوْا اور دوسری آیت میں فَامْشُوْا اور كُلُوْا امر کے صیغے ہیں جو اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ مسلمان کو تلاش رزق کے سلسلہ میں ضرور جدوجہد کرنی چاہیئے۔

اسی نوعیت کی وہ قرآنی آیات بھی ہیں جن میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دریاؤں میں کشتی رانی کا انتظام فرمایا تاکہ تم اُس کا فضل یعنی رزق طلب و تلاش کر سکو، اسی طرح تمہارے لئے رات کو تاریک بنایا کہ تم اس میں نیند کے ذریعے سکون، اور دن کو روشن بنایا کہ تم اُس کی روشنی میں معاشی سعی و کوشش اور تگ و دو کر سکو۔

اس نوع کی آیات میں سے چند بطور مثال ذیل میں نقل کی جاتی ہیں، مثلاً سورۃ الاسراء کی آیت ہے:

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۝
(ع۶۶)

تمہارا رب وہ ہے جو تمہارے لئے دریاؤں میں کشتیاں رواں کرتا ہے تاکہ تم اُس کا فضل یعنی رزق و مال طلب و تلاش کرو۔

دوسری سورۃ القصص کی یہ آیت ہے:

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ۔
(ع۷۳)

اور اُس اللہ کی رحمت میں سے ہے یہ کہ اُس نے تمہارے لئے رات اور دن بنائے تاکہ تم رات میں سکون و آرام پاؤ اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو۔

تیسری سورۃ الاسراء کی یہ آیت ہے:

وَجَعَلْنَا اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ۔
(ع۱۲)

اور ہم نے دن کی نشانی کو روشن کرنے والی بنایا یعنی سورج کو تاکہ تم اس کی روشنی میں اپنے رب کا فضل یعنی رزق تلاش کرو۔

چوتھی سورۃ النباء کی یہ آیت ہے:

وَجَعَلۡنَا الَّيۡلَ لِبَاسًا ۙ وَّجَعَلۡنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ (۷۸:۱۱) — اور رات کو ہم نے لباس کی طرح بنایا اور دن کو وقتِ معاش ٹھہرایا۔

دیکھا جائے تو اسی زمرہ میں وہ قرآنی آیات بھی آتی ہیں جن میں یہ فرمایا گیا ہے کہ کرۂ ارض کی تمام اشیاء اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے تمتع و انتفاع کے لئے پیدا فرمائی ہیں، اور یہ کہ انسان کو اللہ رب العزت نے زمین کی خلافت عطا فرمائی اور اُسے ایسی ذہنی و علمی صلاحیتیں اور فکری و عملی قوتیں مرحمت فرمائی ہیں جن کے ذریعے وہ باقی تمام انواع مخلوقات میں تصرف کر کے اُن سے فائدہ اٹھا سکتا اور اپنے لئے سامان معاش اور مال و متاع حاصل کر سکتا ہے چونکہ انسان کو حقیقت مذکورہ سے آگاہ کرنے کا مقصد و منشا یہی ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی اُن خداداد خلافتی صلاحیتوں اور قوتوں کو استعمال کر کے اشیاء کائنات سے اپنے لئے سامان معیشت اور رزق و مال حاصل کرے اور ان سے فائدہ اٹھائے لہٰذا اس قسم کی قرآنی آیات کا بھی تقاضا یہی ہے کہ انسان حصول رزق و مال کے لئے ضرور سعی و کوشش اور جد و جہد کرے، اس لئے بھی کہ ایسا کرنا شکر نعمت اور نہ کرنا کفران نعمت ہے یعنی اللہ نے جو شے جس مقصد اور فائدے کے لئے پیدا فرمائی ہے اس شے کو اُسی مقصد کے لئے استعمال کرنا اور اس سے وہی فائدہ اٹھانا اللہ کا صحیح شکر اور اس نعمت کی صحیح قدر دانی ہے۔

خلاصہ مختصر یہ کہ مذکورہ قرآنی آیات میں صراحۃً اور اقتضاءً یہ ہدایت پایا جانا کہ مسلمانوں کو رزق و مال کے حصول کے لئے اپنا دینی فریضہ سمجھ کر ضرور جد و جہد کرنی چاہیئے اس پر دلالت کرتا ہے کہ رزق و مال فی نفسہٖ ایک اچھی اور قابل رغبت چیز ہے لہٰذا اُسے بُرا سمجھنا اور اس سے نفرت کرنے کا رویہ خلافِ قرآن اور غیر اسلامی رویہ ہے جس سے ایک مسلمان کو بچنا چاہیئے، یہ رویہ دراصل راہبانہ اور جوگیانہ رویہ ہے جس کی اسلام تردید اور نفی کرتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید میں ایسی نصوص بھی موجود ہیں جن میں مال و متاع سے ایسی محبت کی مذمت اور ممانعت ہے جو مسلمان کو شرعی احکام کی پابندی سے غافل اور بے بہرہ کر دے اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز سے بے پرواہ ہو جائے، ایسی نصوص میں سے ایک نص سورۃ الفجر کی یہ آیت ہے:

وَّتُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ اور تم محبت کرتے ہو مال سے بھرپور محبت، اس آیت میں مال سے بھرپور محبت کے رویّے کی مذمت اور ممانعت ہے، اسی طرح قرآن مجید کی جن آیات میں حرص مال اور جمع مال کی ممانعت ہے وہ بھی محبتِ مال کی نفی کرتی ہیں اسی طرح جن آیات میں بخل و کنجوسی سے منع فرمایا گیا ہے وہ بھی حبِّ مال سے روکتی ہیں کیونکہ مال جمع کرنے کی حرص ہو یا اُسے روک رکھنے کا بخل دونوں کا سبب مال کی محبت ہوتی ہے لہٰذا مسلمان کو حرصِ مال اور بخل مال سے روکنا اور منع کرنا دراصل مال کی محبت سے روکنا اور منع کرنا ہے، اسی طور قرآن کریم کی جن آیات میں مال کو فتنہ سے تعبیر کیا گیا ہے ان میں بھی یہ ہدایت ہے کہ مال سے محبت نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ فتنہ کوئی محبوب اور قابل محبت شے نہیں، جن آیات میں مال کو فتنہ کہا گیا ہے ایک سورۃ الانفال کی یہ آیت ہے:

وَاعْلَمُوْا اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(ع ۲۸)

اور خوب اچھی طرح جان لو کہ سوائے اس کے نہیں کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد آزمائش و امتحان ہیں اور اللہ بہت بخشنے اور رحمت فرمانے والا ہے۔

دوسری سورۃ التغابن کی یہ آیت :

اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۔

(ع ۱۵)

سوائے اس کے نہیں کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد فتنہ و آزمائش ہے اور یاد رکھو کہ اللہ کے پاس عظیم اجر و بدلہ ہے۔

چونکہ فتنہ کے معنے ہیں کسی دھات کو کھرا کھوٹا معلوم کرنے کے لئے آگ کی بھٹی میں ڈالنا، اور چونکہ اموال و اولاد بھی اس لحاظ سے بمنزلہ بھٹی کے ہیں کہ ان کے ذریعے مسلمان کے ایمان کی آزمائش ہوتی اور اس کے کھرے کھوٹے ہونے کا اظہار ہوتا ہے یعنی جو ان کے متعلق احکام الٰہی کی پابندی کرتا وہ کھرا، اور جو ان کی خلاف ورزی کرتا وُہ کھوٹا ثابت ہوتا ہے گویا اموال و اولاد کے ذریعے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ صاحب اموال و اولاد اپنے دعویٰ ایمان میں سچا ہے یا جھوٹا اور اللہ اور رسولؐ کا فرمانبردار ہے یا نافرمان، لہٰذا مذکورہ آیات قرآنی میں اموال و اولاد کو فتنہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ مال کی محبت انسان کو بہت سی ایسی برائیوں پر ابھارتی ہے جن سے قرآن مجید مسلمانوں کو سختی کے ساتھ روکتا اور منع کرتا ہے لہٰذا مال کی محبت قرآن مجید کے نزدیک باطل و مردود قرار پاتی ہے جس سے ایک مسلمان کو ضرور بچنا چاہیئے، ایک حدیث نبویؐ میں حب المال راس کل خطیۃ فرمایا گیا ہے کہ مال کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

حاصل یہ کہ قرآن حکیم مال کے متعلق مسلمان کو جس رویے کے اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے وہ نہ کلی نفرت کا رویّہ ہے اور نہ کامل محبت کا رویّہ بلکہ اُن کے بین بین محبت آمیز نفرت اور نفرت آمیز محبت کا رویّہ ہے اور دیکھا جائے تو یہی وہ رویّہ ہے جو اس صحیح نظام تمدن اور صالح معاشرے کے قیام اور اس کی تعمیر و ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے جو اسلام بروئے کار لانا چاہتا ہے کیونکہ وہ نہ مال کی محبت سے وجود میں آسکتا ہے اور نہ مال کی نفرت سے۔

(باقی ہے)

قربانی کے ہر بال کے بدلے ایک نیکی

عن زید بن ارقم رضی اللہ عنہ قال قال اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا رسول اللہ ما ھٰذہ الاضاحی؟ قال سُنّۃ ابیکم ابراھیم علیہ السلام قالوا ومالنا فیھا یا رسول اللہ؟ قال بکل شعرۃٍ حسنۃٌ قالوا فالصُّوف یا رسول اللہ؟ قال بکلِّ شعرۃٍ من الصُّوف حسنۃٌ۔

ترجمہ:۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ قربانی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیمؑ کی سنت ہے انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس میں ہمارا کیا فائدہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تمہیں ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی ملے گی، انہوں نے پھر عرض کیا یا رسول اللہ! اُون کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا اُون کے ہر بال کے عوض بھی ایک نیکی ملے گی۔ (الترغیب والترھیب)

حدیث (کذا فی الترغیب)

غور کیجئے: اس سے بڑھکر اور کیا ثواب ہوگا کہ ایک قربانی کرنے سے ہزاروں لاکھوں نیکیاں مل جائیں۔ دُنبے اور بھیڑ کے بدن پر لاتعداد بال ہوتے ہیں، اگر کوئی صبح سے شام تک گننا چاہے تو بھی نہ گن سکے۔ تو سوچیئے! ہمارے مختصر سرمائے کے مقابلے میں کتنی بے حساب نیکیاں ملیں۔ اِس قدر اجر و ثواب کو دیکھ کر خوب بڑھ چڑھ کر قربانی کرنی چاہیئے۔

اگر وسعت ہو تو نفلی قربانی بھی کرنی چاہیئے۔

مولانا محمد تقی عثمانی

مصر اور الجزائر میں چند روز

(پانچویں قسط)

اگلے دن صبح کو ڈاکٹر شافعی صاحب کی معیت میں قاہرہ کے مختلف کتب خانوں کی سیر میں وقت گذرا، مصر عربی دینی کتب کی اشاعت کا بڑا عظیم مرکز رہا ہے، اور وہاں سے ہر دینی موضوع پر اتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں کہ ان کی گنتی مشکل ہے۔ لیکن اب رفتہ رفتہ یہاں کے کتب خانے اپنی ماضی کی روایات کھوتے جارہے ہیں۔ اُن شہرۂ آفاق کتب خانوں میں جانا ہوا، جنہوں نے بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں شائع کی ہیں، لیکن اب ان کی مطبوعات کا ذخیرہ بہت کم ہے، دارالمعارف جیسا ادارہ جس نے ماضی میں گرانقدر علمی کتابوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے، اب زیادہ تر ناول اور افسانے شائع کر رہا ہے، اور اس کی قدیم مطبوعات نایاب ہو چکی ہیں ـــ تاہم اس گئی گذری حالت میں بھی مصر علمی کتابوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ "عیسی البابی" "مصطفی البابی" اور "محمد علی صبیح" جن کا نام ہمیشہ کتابوں پر پڑھتے آئے تھے، ان کے مراکز میں جانا ہوا، ظاہری اعتبار سے ان کتب خانوں کی حالت اتنی خستہ ہے کہ وہ دیکھنے میں کباڑ خانے معلوم ہوتے ہیں، لیکن اگر ڈھونڈنے والے کے پاس وقت ہو، اور وہ ریت مٹی کی پروا کئے بغیر ان کی الماریوں میں گھس جائے تو اسے اب بھی بہت سے گوہر نایاب ہاتھ آجاتے ہیں، چنانچہ بحمد اللہ بہت سی وہ نادر کتابیں جن کی عرصے سے تلاش تھی، ان کتب خانوں سے مل ہی گئیں۔

جامعۃ الازہر میں:

دن کے ساڑھے گیارہ بجے شیخ الازہر سے ملاقات کا وقت مقرر تھا، اس لئے کتب خانوں کا

کام بیچ میں چھوڑ کر کچھ دیر کیلئے جامعۃ الازہر اور اس سے ملحقہ دفاتر میں جانا ہوا۔

جامعۃ الازہر اب تو ایک بڑی عظیم الشان یونیورسٹی ہے جس کے تحت بہت سے کلیات اور مدارس کام کر رہے ہیں، لیکن اس کا اصل آغاز اس تاریخی مسجد سے ہوا تھا جو ازہر یونیورسٹی کے ساتھ ہی واقع ہے، اور جامع الازہر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک شاندار مسجد ہے جو ۳۶۱ھ میں تعمیر ہوئی تھی جب معز الدین اللہ کے غلام جوہر الکاتب نے قاہرہ آباد کیا تو اس نے یہ مسجد بنائی تھی، اور مشہور یہ تھا کہ اسکی تعمیر میں کوئی ایسا طلسم رکھا گیا ہے جس کی بنا پر اس عمارت میں کوئی چڑیا، کبوتر یا اور کوئی پرندہ نہیں رہ سکتا۔ بعد میں حاکم بامر اللہ نے اس عمارت کی تجدید کی، اور اس کے لئے بہت سے اوقاف مخصوص کئے (احسن المحاضرۃ السیوطی ص ۱۵۴ و ۱۵۵ ج ۲)۔

بہر کیف! یہ قاہرہ کی (فسطاط کی نہیں) قدیم ترین مسجد ہے، اور چونکہ اس دور میں رواج یہ تھا کہ بڑی بڑی مسجدوں ہی میں حلقۂ درس قائم ہوتے تھے، اور باقاعدہ مدرسے کی شکل بن جاتی تھی، اس لئے یہ مسجد صدیوں تک ایک عظیم دینی درسگاہ کی خدمات انجام دیتی رہی، جس میں بڑے بڑے علماء نے علم حاصل کیا، اور درس دیا۔

چنانچہ اس مدرسے کی شہرت کی بنا پر طلبہ اطرافِ عالم سے آنے لگے تھے، اس لئے آخری دور میں اسی مسجد کے قریب الگ عمارتیں تعمیر کر کے اسے بیسویں صدی کی ایک یونیورسٹی کی شکل دیدی گئی، اب تعلیم "جامع الازہر" میں نہیں، بلکہ "جامعۃ الازہر" میں ہوتی ہے، اور "جامع الازہر" ایک تاریخی مسجد کی حیثیت میں باقی رہ گئی ہے۔

ازہر نے ماضی میں بڑے جلیل القدر علما پیدا کئے، اور اس صدی کے آغاز تک اس نے بے دینی کے سیلاب پر بند باندھنے میں بڑی نمایاں خدمات انجام دیں لیکن رفتہ رفتہ ان لوگوں کا تسلط ہوتا گیا جو مغربی افکار کے سامنے شکست خوردہ اور معذرت خواہانہ طرزِ فکر کے حامل تھے۔ اگرچہ ازہر ہی سے ہمیشہ ایسے متصلب اور راسخ العلم حضرات بھی پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اس طرزِ فکر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن پہلے گروہ کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل رہی، اس لئے وہ ازہر پر چھاتا گیا، یہاں تک کہ اس درسگاہ کا پختہ دینی رنگ ماند پڑ گیا۔ اس کا اثر سب سے پہلے یہاں کی عام علمی فضا پر پڑا اور زندگی کے ہر شعبے میں اتباعِ سنت کا وہ اہتمام جو کسی دینی درسگاہ کی سب سے قیمتی متاع ہے، رفتہ رفتہ کمزور پڑتا گیا۔ علم و تحقیق میں بھی انحطاط آیا، لیکن اس میدان میں پھر بھی ازہر نے کسی درجہ اپنا معیار باقی رکھا ہے، مگر اب یہ علم و تحقیق ایک خشک علم و تحقیق ہے جس میں جذبۂ عمل کی جان شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہے۔ طلبہ اور اساتذہ پر معاملات اور اخلاق میں دین کی عملداری پہلے ہی کم رہ گئی تھی، اس کے بعد عبادات کا اہتمام بھی کمزور پڑا، وضع قطع تبدیل ہونے لگی، چہروں پر سے داڑھیاں گھٹتے گھٹتے بے نشان ہو گئیں، سروں پر عمامے اور جسموں پر جبّے باقی رہ گئے تھے، بالآخر وہ بھی رخصت ہو گئے۔

آج سے تقریباً سات سال پہلے جب میں پہلی بار قاہرہ آیا تھا تو ازہر کے علماء و طلبہ میں

تقریباً چالیس فی صد افراد جُبّے اور عمامے میں نظر آتے تھے، لیکن اس مرتبہ آزہر کے عام ماحول میں ازہر کے اس مخصوص لباس کو نگاہیں ڈھونڈتی ہی رہیں تقریباً ننانوے فیصد افراد مغربی لباس ہی میں ملبوس نظر آئے، اور اساتذہ وطلبہ کو دیکھکر انکے سراپا میں کوئی ایسا امتیاز خوردبین لگاکر بھی نظر نہیں آیا جو ان کو عام لادینی یونیورسٹیوں کے طلبہ سے ممتاز کرسکے۔

بلکہ ایک خوش آئند بات ـ جس کا میں انشاء اللہ آگے قدرے تفصیلی ذکر کروں گا۔ یہ ہے کہ مصر کے عام نوجوانوں میں، بالخصوص کالجوں اور یونیورسٹیوں میں، احیاءِ دین کا ایک غیر معمولی رجحان تیزی سے جڑ پکڑ رہا ہے، یہ نوجوان دین کی طرف لوٹنا اور قوم کو لوٹانا چاہتے ہیں، اور اکثر انکے سراپا میں بھی انکے اس ذوق کا نُور چمکتا ہوا محسوس ہوتا ہے، یہ نوجوان بھی ازہر کی اس فضا اور طرزِ عمل سے نالاں ہیں۔

بہر صورت! یہ ایک حسرت ناک حقیقت ہے کہ ازہر دینی معاملات میں اپنا پہلا جیسا وقار کھو چکا ہے، علم وتحقیق کے میدان میں بیشک وہاں سے مختلف موضوعات پر صفِ اوّل کی کتابیں اور مقالے اب بھی نکل رہے ہیں، اور بحمد اللہ ایسے مقالے بھی کم نہیں ہیں جن میں ٹھیٹھ دینی فکر کارفرما ہوتی ہے، اور جو مغرب کے سامنے معذرت خواہانہ اندازِ فکر پر کھل کر تنقید کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس گئی گذری حالت میں بھی وہاں بعض ایسے علماء موجود ہیں جو علمی دنیا میں طلبہ کے لئے ایک مثال بن سکتے ہیں، لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے، اور وہ یہاں کی عام فضا پر اثر انداز نہیں ہیں۔

شیخ الأزہر اور وکیل الأزہر سے ملاقات

ساڑھے گیارہ بجے شیخ الأزہر شیخ جاد الحق علی جاد الحق سے انکے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ بڑے تپاک خوش اخلاق اور محبت سے ملے۔ شیخ الأزہر کا منصب مصر کے اعلیٰ ترین مناصب میں شمار ہوتا ہے، اور پروٹوکول کی ترتیب میں شیخ الأزہر کا نمبر غالباً وزیر اعظم کے بعد سب سے پہلا ہے، اُنکو سرکاری سطح پر جو مراعات حاصل ہیں، وہ بڑے بڑے وزراء کو حاصل نہیں۔ یہ ازہر کی مرتبہ شناسی کی بڑی قدیم روایت ہے جو ابھی تک باقی چلی آتی ہے۔ ایک زمانے میں آزہر کے شیوخ اپنے اس مرتبے کو دینی مقاصد کے لئے خوب استعمال بھی کرتے تھے، اور حکومت کی طرف سے جب کوئی کام دینی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہوتا تو شیخ الأزہر اپنے اس اثر ورسوخ کو کام میں لاکر اسکی اصلاح کراتے تھے، اور حکومت کے لئے انکے علی الرغم کوئی اقدام کرنا مشکل ہوتا تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ اثر ورسوخ کی یہ نوعیت گھٹتی چلی گئی۔ اب شیخ الأزہر کو رسمی طور پر تو یہ اعلیٰ مرتبہ حاصل ہے، لیکن کاروبارِ حکومت میں انکا کوئی عملی دخل باقی نہیں رہا۔ تاہم اگر اس منصب پر کوئی مخلص جرأت مند اور مدبر شخص آجائے تو وہ بہت سی خرابیوں کے ازالے کے لئے مؤثر کام کرسکتا ہے

موجودہ شیخ الأزہر (شیخ جاد الحق) پہلے مصر کے مفتی رہے ہیں، اور انکے بارے میں یہاں شہرت یہ ہے کہ وہ نسبتاً جرات مند بزرگ ہیں۔ مصر میں نفاذِ شریعت کی جو تحریک چل رہی ہے، ان کے طرزِ عمل سے اس کو فی الجملہ تقویت پہنچی ہے۔

احقر نے تقریباً ایک گھنٹے کی اس ملاقات میں انہیں ذی علم، باوقار، مدبر اور خوش اخلاق پایا۔ ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو رہی، احقر نے اپنی تالیف "تکملہ فتح الملہم" کی پہلی جلد انہیں پیش کی، انہوں نے اسے بڑی دلچسپی سے دیکھا، اور ہمت افزائی کے کلمات کہے۔ ازہر اور مصر کے مجموعی حالات پر بھی گفتگو رہی، واپسی میں وہ دروازے تک چھوڑنے کے لئے تشریف لائے، بہت سی دعائیں دیں اور محبت سے رخصت کیا۔

ان کے بعد وکیل الازہر اور نائب شیخ الازہر شیخ حسینی سے ملاقات ہوئی، یہ ازہر کے انتظامی سربراہ ہیں، اور معروف علمی شخصیت ہیں، مسند احمدؒ پر علامہ احمد شاکر نے جو کام ادھورا چھوڑ دیا تھا، انہوں نے اسکی تکمیل شروع کی ہے، ایک جلد آ بھی چکی ہے، انہوں نے بتایا کہ باقی جلدوں پر کام جاری ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کی مسجد میں

ازہر سے فارغ ہوئے تو نماز ظہر میں کچھ وقت باقی تھا، میں نے اپنے رہنما ڈاکٹر حسن الشافعی سے بہت پہلے کہہ رکھا تھا کہ میں حافظ ابن حجرؒ کے مزار پر بھی حاضر ہونا چاہتا ہوں، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ نماز انہیں کی مسجد میں ادا کر لی جائے۔ چنانچہ ازہر سے نکل کر ہم جامع الحسینؓ[1] کے سامنے کچھ تنگ و تاریک گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک طویل سڑک پر آگئے جو جامع الحاکم پر جا کر ختم ہوئی ہے، یہ بھی پرانے قاہرہ کی سڑک ہے جو اس وقت تو شاہراہ رہی ہوگی، لیکن اب بہت تنگ معلوم ہوتی ہے۔

اس کے دونوں طرف قدیم طرز کا بازار چلا گیا ہے۔ تقریباً ایک ڈیڑھ کلو میٹر چلنے کے بعد بائیں ہاتھ پر ایک طویل گلی تھی، ڈاکٹر حسن الشافی خود ایک عرصے کے بعد یہاں آئے تھے، اس لئے

---

[1] "جامع الحسین" شہید کربلا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے اور یہاں یہ بات مشہور ہے کہ انکا سرِ مبارک یہاں مدفون ہے چنانچہ اس مسجد کے اندر ایک مزار بنا ہوا ہے جس پر ازدحام رہتا ہے، لیکن تاریخی طور پر یہ بات مستند نہیں، بظاہر زیادہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ حضرت حسینؓ کا سرِ مبارک دمشق کی جامع اموی میں مدفون ہے، یہاں کے لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ فاطمی حکمران اپنے عہدِ حکومت میں حضرت امام حسینؓ کا سرِ مبارک یہاں لے آئے تھے، لیکن مصر کے مستند مؤرخین جو فاطمی دور کے بہت بعد ہوئے ہیں۔ مثلاً علامہ سیوطیؒ اور علامہ مقریزیؒ وغیرہ ایسے کسی واقعہ کا ذکر نہیں کرتے، نہ انہوں نے "جامع الحسینؓ" کا کوئی ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بہت بعد کی پیداوار ہے۔

انہیں بہت سے لوگوں سے پتہ پوچھنا پڑا، بالآخر اس گلی کے آخری سرے کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی، یہ "مسجد الحافظ ابن حجر" تھی پہلے ڈاکٹر شافعی کا خیال یہ تھا کہ حافظ ابن حجرؒ کا مزار بھی اسی مسجد میں واقع ہے، لیکن وہاں کوئی مزار نہیں تھا مسجد کے خدام نے بتایا کہ انکا مزار یہاں نہیں ہے، لیکن یہ مسجد انہی کی ہے جس میں وہ نماز بھی پڑھتے تھے، اور درس بھی دیتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انکا مزار قرافہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے مزار کے سامنے واقع ہے، جہاں ہم کل ہو آئے تھے۔ زمانۂ حال میں حافظ ابن حجرؒ کے ایک تذکرہ نگار ڈاکٹر شاکر محمود عبدالمنعم لکھتے ہیں:۔

"حافظ ابن حجرؒ کا مزار سید عتل کے قرافہ کے پیچھے واقع ہے، اس کے بالمقابل حضرت عقبہ بن عامرؓ کا مزار ہے، افسوس ہے کہ یہ قبر بے توجہی کا شکار ہے جس پر مٹی جمی ہوئی ہے .... یہ ایک چھوٹے سے کمرے میں واقع ہے جو مستطیل شکل میں ہے اور زمین سے قدرے بلند ہے، اسکے چاروں گوشوں پر چار بلند ستون ہے جن کی شکل اوپر جا کر مخروطی ہوگئی ہے۔ قبر کے سرہانے ایک دھندلا سا کتبہ ہے جس پر یہ عبارت میں پڑھ سکا:

"ھذا قبر احمد بن علی بن حجر العسقلانی [1]"

بہر کیف اس مزار پر تو حاضری نہیں ہو سکی، لیکن اس مسجد میں نمازِ ظہر پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ ایک چھوٹی سی مسجد ہے، جو اس وقت خستہ حال ہے، لیکن اب اسکی مرمت ہو رہی ہے جس مسجد کو حافظ ابن حجرؒ جیسے علم کے دریائے ناپیدا کنارے نے اپنی فیض رسانی کا مرکز بنایا ہو، اپنے عہدِ شباب میں وہاں تشنگانِ علم کے ازدحام کا کیا عالم ہوگا؟ —— حافظ ابن حجرؒ کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انکا مکان بھی اسی محلے میں کہیں آس پاس واقع تھا۔

یوں تو مشاہیر علمائے سلف کا ہر فرد ہی آفتاب و ماہتاب ہے، لیکن ہم طالب علموں پر جن حضرات کے احسانات بے پایاں ہیں، اور جن کا نام آتے ہی قلب میں عقیدت و محبت کی پھواریں پھوٹنے لگتی ہیں، حافظ ابن حجرؒ اُن میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے علمِ حدیث کی جو خدمت لی ہے، اس کے صحیح مقام کا اندازہ کرنے کے لئے بھی علم کی بھاری مقدار درکار ہے، اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ تھے۔

وہ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ اور انکی تمام تر پرورش انکے والد کے ایک تاجر دوست نے کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بے آسرا بچے کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تحفظ اور اس کی نشر و اشاعت کے لئے چُن لیا تھا، وہ تعلیم میں مشغول ہوئے تو خداداد ذہانت و ذکاوت اور غیر معمولی

---

[1] ابن حجر العسقلانی و دراسۃ مصنفاتہ للدکتور شاکر محمود عبدالمنعم ص ۱۹۴

قوتِ حافظہ کی بدولت اپنے تمام ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ گئے، حدیث میں آپ کے خالص استاذ حافظ زین الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ تھے، وہ آپ کے بارے میں فرماتے تھے کہ "میرے اصحاب میں علمِ حدیث کا ابن حجرؒ سے بڑا عالم کوئی نہیں"[1]

جب حافظ ابن حجرؒ مکہ مکرمہ حاضر ہوئے تو زمزم کا پانی پیتے وقت یہ دعا کی کہ "یا اللہ! مجھے حافظ ذہبیؒ جیسا حافظہ عطا فرما" اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی، بیس سال بعد پھر حاضری ہوئی تو یہ دعا فرمائی کہ "مجھے مزید حافظہ عطا فرما" چنانچہ بعد کے اہلِ نظر علماء کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس معاملے میں حافظ ذہبیؒ پر بھی فوقیت عطا فرمادی تھی۔[5]

عملی زندگی میں اتباعِ سنت کے اہتمام کا عالم یہ تھا کہ لوگ کھانے پینے اور چلنے پھرنے میں انکی ادائیں دیکھ دیکھ کر سنتیں سیکھتے تھے[2]۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک ایسا کھانا کھالیا جو مشتبہ تھا، بعد میں جب اس کا ذریعہ معلوم ہوا تو ایک طشت منگایا، اور فرمایا کہ "ہم وہی کام کریں گے جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا" یہ کہا اور سارا کھانا قے کرکے اگل دیا[2]۔

زندگی نظام الاوقات کی پابند تھی، ہر کام کا وقت مقرر تھا، اور ایک ایک لمحے کو تول تول کر خرچ کرتے تھے، یہاں تک کہ لکھنے کے دوران قلم پر قط رکھنے کی ضرورت پیش آتی تو اتنی دیر بھی بیکار نہ گذارتے اس وقفے میں زبان سے ذکر اللہ میں مشغول ہوجاتے تھے[3]۔ وقت کی اس قدر دانی ہی کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ کام لیا کہ آج اگر انکی تمام تصانیف کو کوئی شخص صرف نقل ہی کرنا چاہے شاید عمر بھر میں وہ نقل بھی نہ ہوسکیں۔ اور تصانیف بھی کوئی عامیانہ نہیں، ایسی محققانہ کہ جو بات قلم سے نکلی، وہ سند بن گئی، بلکہ حدیث کے معاملے میں تو حافظؒ کا محض سکوت فتح الباری اور تلخیص میں (یعنی کسی حدیث کو بیان کرکے اس پر بلا تبصرہ گذر جانا) بھی بہت سے علماء کے نزدیک حجت قرار پاگیا[5]۔

لیکن فتح الباری جیسی بے مثال کتابوں کا مؤلف کسی فخر و ناز میں تو کیا مبتلا ہوتا؟ تواضع کا عالم یہ ہے کہ خود اپنی تصانیف کے بارے میں لکھتے ہیں:-

وأکثر ذلک مما لا تساوی نسخۃ لغیرہ، لکن جری القلم بذلک

میری اکثر تصانیف ایسی ہیں کہ دوسرے علماء کی ایک کتاب کے بھی برابر نہیں، لیکن بس قلم چل گیا[4]!

---

[1] ذیل طبقات الحفاظ للسیوطیؒ ص ٣٨١ -

[2] لحظ الألحاظ، لابن فہد ص ٣٣٦، والضوء اللامع ص ٣٩ ج ٢ -

[3] ابن حجر العسقلانی، للدکتور شاکر، بحوالۂ الجواہر والدرر، ورقہ ٢٣٣ -

[4] ایضاً

[5] لیکن یہ بات اکثری ہے، کلی نہیں۔

البتہ اپنی کتابوں میں صرف فتح الباری، ہدی الساری، تغلیق التعلیق، نخبۃ الفکر، المشتبہ، التہذیب اور لسان المیزان پر اطمینان کا اظہار فرمایا، اور باقی کتب کے بارے میں لکھا:

أما سائر المجموعات فھی کبیرۃ العدد، واھیۃ العُدد، ضعیفۃ القوی،

باقی تمام مجموعات گنتی میں تو زیادہ ہیں، لیکن مواد کے لحاظ سے کمزور ہیں[1]۔"

اپنی تالیفات کے بارے میں یہ اعتراف علم وفضل کی اعلیٰ ترین چوٹیوں کو چھونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ:

حافظ بُلقینیؒ کے مزار

حافظ ابن حجرؒ کی مسجد سے باہر نکلے تو واپسی پر کچھ دور چل کر اسی گلی میں دائیں ہاتھ پر ایک اور مسجد نظر آئی جس کے اوپر ایک بورڈ لگا ہوا تھا، اس بورڈ سے پتہ چلا کہ یہ علامہ عمر بن رسلان البلقینی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔

علامہ عمر بن رسلانؒ البلقینی رحمۃ اللہ علیہ حافظ ابن حجرؒ کے استاذ تھے، حافظ ابن حجرؒ نے جن اساتذہ سے خاص تعلق رکھا، اور بہت استفادہ کیا، ان میں حافظ زین الدین عراقیؒ، علامہ بلقینیؒ اور حافظ ابن الملقنؒ کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ علامہ بلقینیؒ یوں تو حدیث میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے تھے، لیکن ان کا خصوصی موضوع فقہ تھا، اور حافظ ابن حجرؒ نے فقہ میں ان سے خصوصی استفادہ کیا۔ اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ" میں نے زمزم پیتے وقت یہ دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے حدیث میں حافظ ابن حجرؒ کا، اور فقہ میں علامہ بلقینیؒ کا مرتبہ عطا فرمادے[2]۔"

علامہ بلقینیؒ اصلاً شام کے باشندے تھے، لیکن بچپن ہی میں مصر آگئے تھے، اور یہاں کی سکونت اختیار کرلی تھی، پھر ایک عرصہ تک دمشق میں قاضی بھی رہے، لیکن بعد میں پھر مصر لوٹ آئے آخر تک یہیں مقیم رہے۔ حافظے کا عالم یہ تھا کہ جب وہ مدرسہ کاملیہ میں داخل ہوئے تو مدرسے کے مہتمم سے رہائش کے لئے ایک کمرے کی فرمائش کی، مہتمم نے انکار کر دیا۔ لیکن بعد میں ایک روز ایک شاعر آیا، اور اس نے انہی مہتمم صاحب کی تعریف میں ایک طویل قصیدہ سُنایا، جب شاعر قصیدہ ختم کرچکا تو علامہ بلقینیؒ نے کہا کہ "مجھے یہ قصیدہ یاد ہوگیا ہے"، مہتمم صاحب نے کہا کہ اگر تم قصیدہ زبانی سنادو تو میں تمہیں کمرہ دے دوں گا، انہوں نے قصیدہ از بر سُنادیا، اور اس طرح انہیں کمرہ مل گیا[3]۔

---

[1] ابن حجر العسقلانی ص ۲۶۴ بحوالہ الجواھر والدرر ق ۱۵۱ اب [2] حسن المحاضرۃ۔

[3] الضوء اللامع، للسخاویؒ ص ۸۶ ج ۶۔

عصر سے لے کر مغرب تک روزانہ فتوی لکھنے کا معمول تھا، اور دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس پورے عرصے میں قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے تھے۔ البتہ جب کسی فتوی میں ذرا بھی شبہ ہوتا اسے کتابوں کی مراجعت اور مطالعہ کے انتظار میں روک لیتے، اور جب تک پوری طرح شرح صدر نہ ہو جاتا، جواب نہ لکھتے، خواہ اس میں کتنی ہی دیر ہو جاتی۔

درس و تدریس میں آپ کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، علامہ برہان حلبیؒ کہتے ہیں کہ میں ان کے "مختصر صحیح مسلم" کے درس میں بارہا حاضر ہوا، اس حلقے میں چاروں مذاہب کے فقہاء شریک ہوتے تھے، انہوں نے ایک حدیث پر صبح سویرے بیان شروع کیا تو ظہر کے قریب تک اُسی ایک حدیث کا درس جاری رہا۔

لیکن آپ کا علم تصنیف کے ذریعہ زیادہ نہ پھیل سکا، جس کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ کوئی کتاب لکھنا شروع کرتے تو تبحرِ علمی کی بنا پر چھوٹی سے چھوٹی بات کی بہت تفصیل فرماتے، نتیجہ یہ کہ تصنیف مکمل نہ ہو پاتی، پھر دوسری شروع کر دیتے، مثلاً صحیح بخاری کی شرح شروع کی تو صرف بیس حدیث میں دو جلدیں ہو گئیں، اس لئے انکی تصانیف زیادہ نہ ہو سکیں[1]۔

آپ کو بعض حضرات نے نویں صدی کا مجدد بھی قرار دیا ہے، آپ کی وفات ۸۰۵ھ میں ہوئی، اس وقت آپ کے جلیل القدر شاگرد حافظ ابن حجرؒ حج کو گئے ہوئے تھے واپسی پر ان کی وفات کی اطلاع ہوئی تو بہت غمگین ہوئے، اور انکا بڑا پُر درد مرثیہ کہا، جس کا مطلع یہ ہے ؎

یا عین جودی لفقد البحر بالمطر
واذری الدموع ولا تبقی ولا تذری

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

جامع الحاکم

قاہرہ کا تو چپہ چپہ تاریخ ہے، بالخصوص شہر کا یہ علاقہ ایسا ہے کہ کوئی مورخ یا ماہر آثار اگر اسکی ہر تاریخی جگہ کی تحقیق کر کے اس کے حالات مرتب کرے تو اس کے لئے سالہا سال چاہئیں۔ "مسجد الحافظ ابن حجر" والی گلی سے نکل کر بائیں ہاتھ کی طرف چلیں تو ایک بڑی طویل و عریض، شاندار اور قلعہ نما مسجد نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر شافعیؒ نے بتایا کہ یہ "جامع الحاکم" ہے۔ جامع الحاکم ایک ظالم اور جابر فاطمی بادشاہ حاکم بامراللہ کے نام سے منسوب ہے، جسکی رعونت، فرعونیت اور بے سروپا احکام اہل مصر کے لئے سالہا سال وبال بنتے رہے، اور جس کے بارے میں

---

[1] ملاحظہ ہو الضوء اللامع للسخاوی ص ۹۰ ج ۶۔ ولحظ الالحاظ، لابن فہد ص ۲۰۶ تا ۲۱۷ وشذرات الذہب لابن العماد ۵۱ و ۵۲ ج ۷۔

علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ مصر پر فرعون کے بعد اس سے زیادہ بدتر حکمران کوئی نہیں آیا۔ ابتداءً اس کی تعمیر عزیز باللہ نے شروع کی تھی، بعد میں حاکم نے اسکی تکمیل کی، اسی لئے جامع الحاکم کہا جاتا ہے۔ اس مسجد میں بھی مذاہب اربعہ کے حلقہ ہائے درس قائم رہے ہیں[1]۔ لیکن چونکہ یہ فاطمی دور کی عظیم الشان مسجد ہے، اس لئے یہ بوہریوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ اور بوہری فرقے کے لوگ دور دور سے اسکی زیارت کے لئے آتے ہیں۔

ابن ھشام نحویؒ

جامع الحاکم لمبائی میں جس جگہ ختم ہوئی ہے، وہاں بائیں ہاتھ پر ایک قدیم فصیل شروع ہوگئی ہے جو کسی وقت شہر پناہ کا کام دیتی تھی، اس فصیل میں ایک دروازہ ابھی تک موجود ہے جس پر قدامت کے آثار نمایاں ہیں۔ اس دروازے کی بنیاد میں ایک چبوترہ سا بنا ہوا ہے۔ ڈاکٹر شافعیؒ نے بتایا کہ میں نے اپنے اساتذہ اور آباء واجداد سے سُنا ہے کہ یہ چبوترہ مشہور نحوی عالم ابن ہشامؒ کی قبر ہے۔

یہ وہی ابن ھشامؒ ہیں جن کی کتاب "مغنی اللبیب" عربی نحو کے مستند ترین مآخذ میں شمار ہوتی ہے، اور انکی کتاب "قطر الندیٰ" ابتدائی نحو کے لئے بہت سے مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ انکا پورا نام عبداللہ بن یوسف جمال الدین ابن ھشامؒ ہے، فقہ میں پہلے شافعی تھے، پھر حنبلی مسلک اختیار کرلیا تھا، لیکن انہوں نے اپنا خاص موضوع نحو اور ادب کو بنایا، اور اپنے زمانے میں نحو کے مسلم الثبوت امام مانے گئے۔ ابن خلدونؒ کا کہنا ہے کہ ہم نے مغرب ہی میں یہ شہرت سُن لی تھی کہ مصر میں نحو اور علوم عربیت کا ایک ایسا عالم پیدا ہوا ہے جو نحو میں سیبویہ سے زیادہ ماہر ہے۔ مذکورہ دو کتابوں کے علاوہ انہوں نے اور بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں، اور ذی القعدہ ۷۶۱ھ میں وفات پائی[2]۔

علامہ عینیؒ کی مسجد

ہم یہاں سے واپس ہوتے ہوئے دوبارہ جامعۃ الازھر پہنچے، کیونکہ ہماری گاڑی وہیں کھڑی ہوئی تھی۔ جامع الازھر کی پشت پر ایک چھوٹی سی گلی ہے، اس گلی میں ایک مسجد کے پاس سے گذرے تو ڈاکٹر شافعیؒ نے بتایا کہ یہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد ہے، اور اسی میں ان کا مزار بھی واقع ہے۔

ہم جیسے طالب علموں کے لئے یہاں کچھ دیر رُکنے کے لئے یہ کوشش کم نہ تھی کہ یہ علامہ عینیؒ کا محلّہ،

---

[1] حسن المحاضرۃ للسیوطیؒ ص ۱۵۵ ج ۲۔

[2] الدرر الکامنہ، للحافظ ابن حجر ص ۳۰۸ تا ۳۱۰ ج ۲۔

انکی مسجد، انکا مدرسہ اور انکا مزار تھا، وہی علامہ عینیؒ جن کے احسانات سے اُمّتِ مسلمہ، بالخصوص حنفی علماء کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ انکی شرح بخاری، شرح ہدایہ اور شرح کنز فقہِ حنفی کا بہت بڑا ماٰخذ شمار ہوتی ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی ہر علم وفن میں انکی تصانیف اتنی زیادہ ہیں کہ حافظ سخاویؒ جیسے مردم شناس (اور علماء کی تعریف میں بہت محتاط) بزرگ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ میری معلومات میں ہمارے شیخ (یعنی حافظ ابن حجرؒ) کے بعد علامہ عینیؒ سے زیادہ کثیر التصانیف بزرگ کوئی اور نہیں۔ انہوں نے جامع الازھر کے قریب ہی اپنی مسجد اور مدرسہ اس لئے بنایا تھا کہ وہ جامع الازھر میں نماز پڑھنا کراہت سے خالی نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ اسے ایک تبرّائی رافضی نے وقف کیا تھا۔[1]

علامہ عینیؒ کو اللہ تعالیٰ نے علم وفضل، حافظے اور قوتِ تحریر کا ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا جو خال خال ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ سرعتِ تحریر کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ پوری مختصر القدوریؒ ایک رات میں نقل کر دی۔

حافظ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ کے درمیان معاصرانہ چشمک مشہور ومعروف ہے۔ اگرچہ علامہ عینیؒ عمر میں حافظ ابن حجرؒ سے بارہ سال بڑے تھے، اور حافظؒ نے ان سے بعض احادیث بھی پڑھی ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی وہ ایک دوسرے کے معاصر ہی شمار ہوتے تھے، حافظؒ شافعی تھے، اور علامہ عینیؒ حنفی، وہ بھی قاضی رہے، اور یہ بھی، انہوں نے بھی بخاری شریف کی شرح لکھی، اور انہوں نے بھی، اس لئے دونوں کے درمیان لطیف علمی چوٹیں چلتی رہتی تھیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے اپنی شرح پہلے لکھنی شروع کی تھی، اور وہ اپنے شاگردوں کو املاء بھی کراتے جاتے تھے، ان شاگردوں میں سے ایک علامہ برہان الدین ابن خضر کا تعلق علامہ عینیؒ سے بھی تھا، علامہ عینیؒ نے ان سے خواہش کی کہ وہ اپنی لکھی ہوئی کاپیاں انکو مستعار دیدیا کریں، علامہ ابن خضرؒ نے حافظ سے اجازت لے کر علامہ عینیؒ کو شرح کے حصے مستعار دینے شروع کر دیئے، اور اس طرح علامہ عینیؒ نے اپنی شرح کی تالیف کے وقت حافظؒ کی شرح کو سامنے رکھا، اور جا بجا اس پر تنقید بھی فرمائی۔ بعد میں حافظؒ نے علامہ عینیؒ کے اعتراضات کے جواب میں مستقل دو کتابیں لکھیں۔

دونوں کی لطیف چوٹوں کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کے حکمران "الملک المؤیدؒ" کی سیرت پر علامہ عینیؒ نے ایک طویل قصیدہ کہا تھا، جس میں اسکی بنائی ہوئی جامع مسجد کی بھی تعریف تھی، اتفاق سے کچھ دن بعد اس مسجد کا منارہ جھک کر گرنے کے قریب ہوگیا، اس پر حافظ ابن حجرؒ نے پرچے پر دو شعر لکھکر بادشاہ کے پاس بھیج دیئے

لجامع مولانا المؤید رونق	منارتہ تزھو علی الفخر والزین
تقول، وقد مالت، علیٰ ترفقوا	فلیس علیٰ حسنی أضرّ من العینی

---

[1] الضوء اللامع، للسخاویؒ، ص ۱۳۲ ج ۱۰۔

(یعنی: جناب مؤید کی جامع مسجد بڑی بارونق ہے، اور اس کا منارہ فخر و زینت کی وجہ سے بڑا خوشنما، لیکن جب وہ جھکا تو اس نے کہا کہ: مجھ پر رحم کرو، کیونکہ میرے حسن کے لئے "عین" (چشم بد) سے زیادہ نقصان دہ کوئی چیز نہیں)۔

اس شعر میں لطف یہ ہے کہ اس میں "عین" کو "عینی" پڑھا جاتا ہے، جس سے علامہ عینیؒ پر تعریض ہوتی ہے۔

ملک مؤید کو یہ رقعہ ملا تو اس نے علامہ عینیؒ کے پاس بھیج دیا، اس پر علامہ عینیؒ نے دو شعر لکھکر واپس بھیجے:۔

منارۃ کعروس الحسن قد جلیت — وهدمها بقضاء الله والقدر

قالوا: أصیبت بعین، قلت ذا خطأ — وإنما هدمها من خیبة الحجر[1]

یعنی (یہ منارہ عروس حسن کی طرح درخشاں ہے، اور اس کا گرنا محض اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر کی وجہ سے ہوا ہے، لوگ کہنے لگے کہ اسے نظر لگ گئی، میں نے کہا: یہ غلط ہے، دراصل وہ اپنے "حجر" (پتھر) کے فساد کی بنا پر گرا ہے)۔

علامہ دردیر مالکیؒ

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد سے ذرا آگے بڑھے تو وہاں مشہور مالکی فقیہ علامہ احمد الدردیر مالکی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار تھا، یہ وہی بزرگ ہیں جنکی مختصر خلیل کی شرح کو اب فقہ مالکی کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بارھویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں جنہوں نے جامع الازہر میں تعلیم حاصل کی، اور فقہ و تصوف کے امام سمجھے گئے۔ یہاں تک کہ انکو "مالک الصغیر" (چھوٹے امام مالک) کہا جانے لگا۔

اس وقت مغرب (مراکش) کا بادشاہ علماء ازھر کو ہدیہ بھیجا کرتا تھا، ایک مرتبہ (۱۱۹۸ھ) میں کچھ ہدیہ علامہ دردیرؒ کی خدمت میں بھی بھیجا، اتفاق سے اسی سال بادشاہ کا بیٹا حج کو گیا تھا، اور واپسی میں جب مصر پہنچا تو اس کا سفر خرچ ختم ہو چکا تھا، علامہ دردیرؒ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے پاس آئی ہوئی ہدیہ کی رقم انکو بھجوادی ـــــ آئندہ سال بادشاہ نے انہیں دس گنا زائد ہدیہ بھیجا، شیخؒ نے اس رقم سے حج کیا، اور باقی ماندہ رقم سے اپنی مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی، اور آخر عمر تک اسی میں تدریسی اور تصنیفی خدمات انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ ۱۲۰۱ھ میں وفات ہوئی۔

علامہ دردیرؒ کے مزار پر حاضری کے بعد ہم نے ہوٹل واپس آکر کچھ دیر آرام کیا، پھر اس روز شام کو اور اگلے دن بارہ بجے تک مختلف کتب خانوں کی سیر اور خریداری کتب میں وقت گذرا۔ اور دوپہر

---

[1] ابن حجر العسقلانی، شاکر محمود عبد المنعم ص ۱۷۸ بحوالہ الیواقیت والدرر۔

کے کھانے کے بعد وطن واپسی کے لئے ایئرپورٹ روانہ ہوگئے۔

مجموعی تأثرات

مصر صدیوں علم ودین کا گہوارہ بنا رہا ہے، اور اس سرزمین نے علوم اور دینی اخلاق کے وہ آفتاب وماہتاب پیدا کئے ہیں جن پر تاریخ ہمیشہ فخر کرے گی۔ لیکن جس طرح اس ملک نے مدتوں علمی اور دینی اعتبار سے عالم اسلام کی قیادت کی ہے، اسی طرح مغربی افکار کے استیلار کے بعد اسی ملک کے بعض "دانشوروں" نے مغربیت کی نشر واشاعت میں بھی بھرپور حصہ لیا، "مفتی محمد عبدہ" "سید رشید رضا" انکے بعد "طٰہٰ حسین" اور "احمد امین" جیسے متجددین اسی ملک میں پیدا ہوئے جنکے افکار اور تجربوں نے پورے عالم اسلام کے تجدد پسند حلقے کو اسلحہ فراہم کئے، یہاں تک کہ ازہر جیسا علمی مرکز بھی اسکی لپیٹ میں آگیا۔

دوسری طرف راسخ العقیدہ اہلِ علم کی تعداد بھی یہاں کبھی کم نہیں رہی، اور انہوں نے شروع میں ان افکار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن اوّل الذکر حلقے کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل رہی، اس لئے علمی زندگی میں اس حلقے کے اثرات غالب آتے چلے گئے۔ اس سلسلے کی انتہا جمال عبدالناصر کے عہدِ حکومت میں ہوئی، جس نے دین کو نظامِ حکومت کی بنیاد قرار دینے کی ہر تحریک کو انتہائی تشدد کے ساتھ کچل کر رکھ دیا۔ اخوان المسلمین کے افراد عموماً اخلاص اور دینی جذبے دونوں سے سرشار تھے، اور انہوں نے بڑی زبردست قربانیاں پیش کیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا طریقِ کار منتخب کرنے میں بھی ہوش وحکمت اور تدبر سے اتنا کام نہیں لیا جتنا جوش سے۔ بہرکیف! جمال ناصر کے عہد میں دین عملاً جاری کرنے کی فکر کا گلا گھونٹ دیا گیا، اور ملک میں عربی قوم پرستی، بے دینی، عریانی اور فحاشی کا ایک سیلاب امڈ آیا۔

انور السادات کے عہد میں دینی حلقوں کے ساتھ قدرے نرمی کا معاملہ کیا گیا، اور بظاہر موجودہ حکومت بھی اسی پالیسی پر گامزن ہے، چنانچہ اس دور میں تبلیغ ودعوت کا کام خاصا آگے بڑھا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام میں دینی جذبے کی وہ چنگاری جسے زبردستی دبایا گیا تھا، اب اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔

ایک طرف حکومتوں کی مسلسل مغرب نواز پالیسیوں کا اثر یہ ہے کہ اب بھی عریانی وفحاشی کا بازار گرم ہے، اور بعض علاقوں میں لوگوں کی حرکتیں دیکھ کر یہ فیصلہ مشکل ہوتا ہے کہ یہ یورپ کا کوئی شہر ہے، یا عالم اسلام کا؟ شراب نوشی کی وبا بھی عام ہے، ذرائع ابلاغ کسی ادنیٰ ٹو رعایت کے بغیر علی الاعلان عریانی وفحاشی کی تبلیغ کر رہے ہیں، لیکن دوسری طرف نوجوانوں میں دین کی طرف لوٹنے کا ایک غیر معمولی جذبہ بیدار ہو رہا ہے، اور مختلف تبلیغی حلقے اس سمت میں متواتر کام کر رہے ہیں،

تبلیغی جماعت کے آثار بھی ماشاء اللہ نمایاں محسوس ہوتے ہیں، اس کے علاوہ اخوان کے افراد بھی مختلف ذرائع سے نوجوانوں میں اسلام کو عملاً برپا کرنے کا جذبہ پیدا کر رہے ہیں، اس وقت مصر میں نفاذِ شریعت کا آوازہ بلند کرنے میں ایک بڑی مسجد کے خطیب حافظ سلامہ پیش پیش ہیں، لیکن جن دنوں میں وہاں تھا، وہ جیل میں تھے۔

پہلے کے مقابلے میں حکومت کی نرم پالیسی کے باوجود نوجوانوں میں بڑھتے ہوئے دینی رجحان کو حکومت کے حلقوں میں کن نظروں سے دیکھا جارہا ہے؟ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگائیے کہ ان نوجوانوں نے چھوٹے چھوٹے پرچوں (STICKERR) پر کلمۂ طیبہ ـــــ اور صرف کلمۂ طیبہ ـــــ لکھکر لوگوں میں تقسیم کیا تھا، اور یہ اپیل کی تھی کہ یہ پرچے کاروں پر چسپاں کئے جائیں، کچھ ہی عرصے میں یہ پرچے اس قدر عام ہوئے کہ قاہرہ کے تقریباً ہر کار پر چسپاں ہوگئے ـــــ حکومت نے اس صورتِ حال کا بھی نوٹس لیا، اور فوری طور پر کاروں سے یہ پرچے ہٹانے کا حکم صادر کیا۔

اس اقدام پر نوجوانوں کی برافروختگی ایک طبعی امر تھی، چنانچہ میرے دورانِ قیام میں ان کے اور پولیس کے درمیان کشمکش جاری رہی۔

تاہم اگر دینی حلقے اخلاص، حکمت، تدبر اور استقامت کے ساتھ دعوت کا کام جاری رکھیں اور کام کے پہلے ہی مرحلے میں حکومت کو براہِ راست اپنا مدِمقابل بنا کر اپنے لئے غیر معمولی رکاوٹیں کھڑی کرنے کے بجائے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق پر اس دعوت کو سرکاری حلقوں تک وسعت دیں تو انشاء اللہ رفتہ رفتہ حالات کے روبہ اصلاح ہونے کی اُمید کی جاسکتی ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

قربانی کے جانور کا پہلا قطرہ گرتے ہی تمام گناہوں کی بخشش

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
اے فاطمہؓ! جاؤ اپنی قربانی پر حاضر رہو، کیونکہ اس کے خون سے جونہی پہلا قطرہ گرے گا تمہارے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے، نیز وہ جانور (قیامت کے دن) اپنے خون اور گوشت کے ساتھ لایا جائے گا اور پھر اُسے ستر گنا بھاری کرکے) تمہارے میزان میں رکھا جائے گا۔

(الترغیب والترہیب)

تشریح:
قربانی نہایت خوش دلی اور فراخ دل سے کرنی چاہیئے۔ اپنی قربانی اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا افضل ہے۔ اگر خود ذبح نہ کرے تو ذبح کے وقت وہاں خود حاضر رہنا افضل ہے۔

ایک بندۂ خدا

مولانا عبدالروف صاحب

مسائلِ قربانی

قربانی کس پر واجب ہے:

جس شخص پر زکوٰۃ فرض ہو یا جس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت ہو یا اتنی قیمت کا مال تجارت ہو یا فاضل سامان پڑا ہو اس پر قربانی اور صدقۂ فطر واجب ہو جاتے ہیں، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ جس پر زکوٰۃ فرض نہیں اس پر قربانی بھی واجب نہیں، یہ بات صحیح نہیں ہے' یوں کہنا تو درست ہے کہ جس پر زکوٰۃ فرض ہے اس پر قربانی بھی واجب ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ جس پر زکوٰۃ فرض نہیں، اس پر قربانی واجب نہیں، کیونکہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن پر زکوٰۃ فرض نہیں اس لئے کہ ان کے پاس سونا چاندی یا مال تجارت یا نقدی نصاب کے بقدر نہیں ہوتی، لیکن بہت سا فاضل سامان پڑا ہوتا ہے (جیسے استعمال کیا ہوا ضرورت سے زائد فرنیچر وغیرہ) اگر یہ فاضل سامان ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کو پہنچ جائے تو قربانی واجب ہو جاتی ہے لیکن زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی، ایک فرق اور بھی ہے وہ یہ کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا اس وقت فرض ہوتا ہے جب نصاب پر چاند کے اعتبار سے بارہ مہینے گزر جائیں اور قربانی واجب ہونے کیلئے

قربانی کی تاریخ آنے سے پہلے چوبیس گھنٹے گزرنا بھی ضروری نہیں ہے اگر کسی کے پاس بقرعید کی نویں تاریخ کو عصر کے وقت ایسا مال آیا جسکے ہونے سے قربانی واجب ہو جاتی ہے اور وہ کل صبح تک اسکی ملکیت میں بھی رہا تو اس پر کل کو قربانی واجب ہو جائیگی اس سے معلوم ہوا کہ جو بھی صاحب نصاب ہو اس پر قربانی واجب ہے اور ہر ایک کی ملکیت علیٰحدہ دیکھی جائیگی اگر کسی گھر میں باپ، بیٹے، بیٹوں کی ماں، ہر ایک کی ملکیت میں اتنا مال ہو جس پر قربانی واجب ہوتی ہے تو ہر ایک پر علیٰحدہ علیٰحدہ قربانی واجب ہوگی، البتہ نابالغ کی طرف سے کسی حال میں قربانی کرنا لازم نہیں، عورتوں کے پاس عموماً اتنا زیور ہوتا ہے جس پر قربانی واجب ہو جاتی ہے۔

قربانی کے جانور:

قربانی کے جانور شرعاً مقرر ہیں گائے، بیل، بھینس، بھینسا، اونٹ، اونٹنی، بکرا، بکری، بھیڑ، بھیڑا، دُنبہ، دُنبی کی قربانی ہو سکتی ہے ان کے علاوہ اور کسی جانور کی قربانی درست نہیں اگرچہ کتنا زیادہ قیمتی ہو اور کھانے میں جس قدر بھی مرغوب ہو، لہٰذا ہرن کی قربانی نہیں ہو سکتی، اسی طرح دوسرے حلال جنگلی جانور قربانی میں ذبح نہیں کئے جا سکتے۔ (عالمگیری)

مسئلہ: گائے، بیل، بھینس، بھینسا، اونٹ، اونٹنی میں سات حصے ہو سکتے ہیں یعنی ان میں سے ایک جانور سے سات قربانیاں ہو سکتی ہیں خواہ ایک ہی آدمی ایک گائے لیکر اپنے گھر کے آدمیوں کے وکیل بنانے سے ان کا وکیل بن کر سات حصے تجویز کر کے ذبح کر دے یا مختلف گھروں کے آدمی ایک ایک یا دو، دو حصے لیکر سات پورے کر لیں، مگر شرط یہ ہے کہ جتنے شریک ہوں ہر ایک کی نیت قربانی کی ہو یا کسی نے عقیقہ کے لئے ایک دو حصے لئے ہوں چونکہ عقیقہ میں بھی اللہ ہی کے لئے خون بہایا جاتا ہے اس لئے عقیقہ کا حصہ قربانی کے جانور میں لیا جا سکتا ہے جتنے لوگوں نے قربانی کے جانور میں شرکت کی، اگر ان میں سے کسی ایک آدمی کی نیت بھی اس گوشت کی تجارت کرنے یا محض گوشت کھانے کی ہو تو کسی کی قربانی ادا نہ ہوگی اور اگر بھینس، گائے، اونٹ میں سات حصوں سے کم حصے کر کے چھ آدمیوں نے ایک ایک حصہ لے لیا یا پانچ آدمیوں نے پانچ حصے کر کے ایک ایک حصہ لے لیا تب بھی قربانی درست ہو جائے گی بشرطیکہ کسی کا حصہ ساتویں حصے سے کم نہ ہو۔ اور اگر آٹھ حصے بنا لئے اور آٹھ قربانی والے شریک ہو گئے تو کسی کی بھی قربانی درست نہ ہوگی۔ (عالمگیری)

مسئلہ: چھوٹے جانور یعنی بکرا، بکری وغیرہ میں شرکت نہیں ہو سکتی، ایک شخص کی جانب

سے ایک ہی جانور ہو سکتا ہے۔ (عالمگیری)

قربانی کے جانور کی عمریں :

مسئلہ : گائے، بیل، بھینس، بھینسا کی عمر کم از کم دو سال اور اونٹ، اونٹنی کی عمر کم از کم پانچ سال اور باقی جانوروں کی عمر کم از کم ایک سال ہونا ضروری ہے۔ ہاں اگر بھیڑ یا دنبہ سال بھر سے کم کا ہو لیکن موٹا تازہ اتنا ہو کہ سال بھر والے جانوروں میں چھوڑ دیا جائے تو فرق محسوس نہ ہو تو اس کی قربانی بھی ہو سکتی ہے بشرطیکہ چھ مہینے سے کم کا نہ ہو۔

قال علیہ الصلوٰۃ والسلام لا تذبحوا الا مسنۃ الا ان یعسر علیکم فتذبحوا جذعۃ من الضان ۔ (رواہ مسلم و عالمگیر)

مسئلہ : اگر جانور کا فروخت کرنے والا پوری عمر بتلاتا ہے اور ظاہری حالات سے اس کے بیان کی تکذیب نہیں ہوتی تو اس پر اعتماد کرنا جائز ہے۔ (احکام عید الاضحیٰ و قربانی)

کیسے جانور کی قربانی درست ہے :

چونکہ قربانی کا جانور بارگاہ خداوندی میں پیش کیا جاتا ہے اس لئے بہت عمدہ، موٹا، تازہ، صحیح سالم، عیبوں سے پاک ہونا ضروری ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ قربانی کے جانور کے آنکھ، کان خوب اچھی طرح دیکھ لیں اور ایسے جانور کی قربانی نہ کریں جس کے کان کا پچھلا حصہ یا اگلا حصہ کٹا ہوا ہو اور نہ ایسے جانور کی قربانی کریں جس کا کان چیرا ہوا ہو، یا جس کے کان میں سوراخ ہو۔ (رواہ الترمذی)۔

اور حضرت براء ابن عازب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ قربانی میں کیسے جانوروں سے پرہیز کیا جائے، آپ نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ (خصوصیت کے ساتھ) چار طرح کے جانوروں سے پرہیز کرو :

۱۔ اَلْعَرْجَاءُ الْبَیِّنُ ظَلْعُهَا، یعنی وہ لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو۔

۲۔ وَالْعَوْرَاءُ الْبَیِّنُ عَوَرُهَا، یعنی وہ کانا جانور جس کا کانا پن ظاہر ہو۔

۳۔ وَالْمَرِیْضَةُ الْبَیِّنُ مَرَضُهَا۔ یعنی ایسا بیمار جانور جس کا مرض ظاہر ہو۔

۴۔ وَالْعَجْفَاءُ الَّتِیْ لَا تُنْقِیْ، یعنی ایسا دبلا، مریل جانور جس کی ہڈیوں میں مینگ

گودا نہ رہا ہو۔ (رواہ مالک والترمذی وابوداؤد وغیرہ)

حضرات فقہاء کرام نے ان احادیث کی تفسیر وتشریح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ جو جانور بالکل اندھا ہو یا بالکل کانا ہو یا ایک آنکھ کی تہائی روشنی یا اس سے زیادہ روشنی جاتی رہی ہو یا ایک کان کا تہائی حصہ یا اس سے زیادہ کٹ گیا ہو یا دُم کٹ گئی ہو یا اس کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ کٹ گیا ہو یا اتنا دُبلا جانور ہو کہ اس کی ہڈیوں میں بالکل گودا نہ رہا ہو اس کی قربانی جائز نہیں اگر جانور دُبلا ہو مگر اتنا زیادہ دُبلا نہ ہو تو اس کی قربانی ہو جائے گی۔ (عالمگیری)

لیکن وہ ثواب کہاں ملے گا۔ جو موٹے تازے جانور کی قربانی میں ملتا ہے، اللہ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لئے گری پڑی حیثیت کا جانور اختیار کرنا ناسمجھی بھی ہے اور ناشکری بھی۔

مسئلہ: جو جانور تین پاؤں پر چلتا ہے اور چوتھا پاؤں رکھتا ہی نہیں یا چوتھا پاؤں رکھتا تو ہے مگر اس سے چل نہیں سکتا، یعنی چلنے میں اس سے کچھ سہارا نہیں لیتا تو اس کی قربانی درست نہیں اگر چاروں پاؤں سے چلتا ہے لیکن پاؤں میں کچھ لنگ ہے تو اس کی قربانی درست ہے۔ (شامی)

مسئلہ: جس جانور کے بالکل دانت نہ ہوں اس کی قربانی درست نہیں اور اگر کچھ دانت گر گئے لیکن جو باقی ہیں وہ تعداد میں گر جانے والے دانتوں سے زیادہ ہیں تو اس کی قربانی درست ہے۔ (درمختار)

مسئلہ: اگر کسی جانور کے پیدائش ہی سے کان نہیں تو اس کی قربانی درست نہیں اور اگر دونوں کان ہیں ہیں اور صحیح سالم ہیں لیکن ذرا چھوٹے چھوٹے ہیں تو اس کی قربانی ہو سکتی ہے۔ (عالمگیری)

مسئلہ: جس جانور کے پیدائش ہی سے سینگ نہیں لیکن عمر اتنی ہو چکی ہے جتنی عمر قربانی کے جانور کی ہونی لازم ہے تو اس کی قربانی درست ہے اور اگر سینگ نکل آئے تھے اور ان میں ایک یا دونوں کچھ ٹوٹ گئے تو ان کی بھی قربانی ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر بالکل جڑ سے ٹوٹ گئے اور اندر کی مینگ بھی ختم ہو گئی تو اس کی قربانی درست نہیں۔ (شامی)

مسئلہ: خصی جانور کی قربانی نہ صرف یہ کہ درست ہے بلکہ افضل ہے کیونکہ اس کا گوشت اچھا ہوتا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایسے جانوروں کی قربانی کی ہے۔

نقد روی ابو داؤد وغیرہ عن جابر رضی اللہ عنہ قال ذبح النبی

صلی اللہ علیہ وسلم یوم الذبح کبشین اقرنین املحین موجوئین ۔ (عالمگیری)

مسئلہ: اگر مادہ جانور کی قربانی کی اور اس کے پیٹ میں بچہ نکل آیا تب بھی قربانی ہو گئی اگر وہ بچہ زندہ ہے

تو اس کو بھی ذبح کر دے۔ (شامی)

مسئلہ: اگر قربانی کا جانور خرید لیا پھر اس میں کوئی ایسا عیب پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے قربانی درست

نہیں ہوتی تو اس کے بدلہ دوسرا جانور خرید کر کے قربانی کرے، ہاں اگر غریب آدمی ہو جس پر

قربانی واجب نہیں تھی تو اسی کی قربانی کر دے۔ (عالمگیری)

مسئلہ: کسی پر قربانی واجب نہیں تھی لیکن اس نے قربانی کی نیت سے جانور خرید لیا تو اب اسی جانور کی

قربانی واجب ہو گی۔ (عالمگیری)

مسئلہ: کسی پر قربانی واجب تھی لیکن قربانی کے تینوں دن گزر گئے اور اس نے قربانی نہیں کی، تو ایک

بکری یا بھیڑ کی قیمت خیرات کر دے اور اگر بکری خریدی تھی تو بعینہٖ وہی بکری خیرات کر دے۔

قربانی کا وقت:

بقرعید کی دسویں تاریخ سے لیکر، بارھویں تاریخ کی شام تک قربانی کرنے کا وقت ہے، چاہے

جس دن قربانی کرے، لیکن قربانی کا سب سے افضل دن بقرعید کا دن ہے پھر گیارھویں تاریخ پھر بارھویں تاریخ۔ (عالمگیری)

مسئلہ: بارھویں تاریخ کا سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے قربانی کر لینا درست ہے جب سورج ڈوب گیا

تو اب قربانی کرنا درست نہیں۔ (عالمگیری)

مسئلہ: دسویں سے بارھویں تک جب جی چاہے قربانی کرے، چاہے دن میں، چاہے رات، لیکن

رات کو ذبح کرنا بہتر نہیں کہ شاید کوئی رگ نہ کٹے اور قربانی نہ ہو اور اگر خوب زیادہ روشنی ہو، جیسا

کہ شہروں میں بجلی کی ہوتی ہے تو رات کو قربانی کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (عالمگیری بتصرف)

مسئلہ: قربانی کی کھال یا تو یونہی خیرات کر دے اور یا بیچکر اس کی قیمت خیرات کر دے وہ قیمت ایسے

لوگوں کو دے جن کو زکوٰۃ کا پیسہ دینا درست ہے اور قیمت میں جو پیسے ملے ہیں بعینہٖ وہی پیسے خیرات

کرنا چاہئیں، اگر وہ پیسے کسی کام میں خرچ کر ڈالے اور اتنے ہی پیسے اور اپنے پاس سے دیدیئے

تو اچھا نہیں کیا مگر ادائیگی ہو گئی۔

مسئلہ۔ اس کھال کی قیمت مسجد یا مدرسہ کی تعمیر میں یا مدرس، مؤذن و امام کی تنخواہ میں دینا درست نہیں ہے اگر ایسی غلطی کرلی ہے تو اس قدر رقم مسکینوں کو دیدیں اور توبہ بھی کریں، آجکل سستا چندہ دیکھ کر بہت سی انجمنیں اور ویلفیئر ایسوسی ایشنیں اور ہمدرد وکلب اور امدادی کمیٹیاں نکل آتی ہیں اور کھالوں کا چندہ کرلیتی ہیں ان میں وہ بے دین بھی ہوتے ہیں جو اسلام اور قربانی کا مذاق اڑاتے ہیں مگر کھال کھینچنے کو تیار رہتے ہیں اور وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو شریعت کے قوانین سے واقف نہیں ہوتے، یہ لوگ شریعت کے احکام کی رعایت کئے بغیر آزادانہ رائے سے خرچ کرتے ہیں ان کو کھالیں دیکر ضائع نہ کریں ان کو دیکر آپ شرعی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہوں گے۔

(چرم قربانی کے مسائل تفصیل سے آگے آرہے ہیں۔)

قربانی کی منت اور وصیت:

مسئلہ: جس نے قربانی کرنے کی منت مانی پھر وہ کام پورا ہوگیا جس کے واسطے منت مانی تھی تو اب قربانی کرنا واجب ہے چاہے مالدار ہو یا نہ ہو، اور منت کی قربانی کا سب گوشت فقیروں کو خیرات کرنا واجب ہے نہ آپ کھائے نہ امیروں کو دے، جتنا آپ نے کھایا ہو یا امیروں کو دیا ہو، اتنا پھر خیرات کرنا پڑے گا۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص وصیت کرکے مرگیا کہ میرے ترکہ میں سے میری طرف سے قربانی کی جائے، اور اس کی وصیت کے مطابق اسی کے مال سے قربانی کی گئی تو اس قربانی کا تمام گوشت وغیرہ خیرات کردینا واجب ہے (واضح رہے کہ وصیت میت کے ترکہ کے ثلث کے اندر اندر نافذ ہوسکتی ہے)۔

غائب کی طرف سے قربانی:

کوئی شخص یہاں موجود نہیں ہے اور دوسرے شخص نے اس کی طرف سے بغیر اس کے کہنے یا خط لکھنے کے قربانی کردی، تو یہ قربانی صحیح نہیں ہوئی اور اگر کسی جانور میں کسی غائب کا حصہ بدون اسکے امر کے تجویز کرلیا تو اور حصہ داروں کی قربانی بھی صحیح نہ ہوگی، البتہ اگر غائب آدمی کو خط لکھ کر وکیل بنادے تو اس کی طرف سے قربانی کرسکتے ہیں جن کے لڑکے ایشیا کے کسی دور کے شہر میں ہیں یا یورپ، افریقہ امریکہ میں ملازم ہیں اگر وہ لکھ دیں کہ ہماری طرف سے قربانی کردی جائے تو ان کی طرف سے قربانی کرنے سے ادا ہوجائے گی۔

قربانی کے بدلے میں خیرات کرنا:

اگر قربانی کے دن گزر گئے، ناواقفیت یا غفلت یا کسی عذر سے قربانی نہ کرسکا تو قربانی کی قیمت فقراء، مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے لیکن قربانی کے تین دنوں میں جانور کی قیمت صدقہ کردینے سے یہ واجب ادا نہ ہوگا ہمیشہ گنہگار رہے گا کیونکہ قربانی ایک مستقل عبادت ہے جیسے نماز پڑھنے سے روزہ اور روزہ رکھنے سے نماز ادا نہیں ہوتی، زکوٰۃ ادا کرنے سے حج ادا نہیں ہوتا، ایسے ہی صدقہ خیرات کرنے سے قربانی ادا نہیں ہوتی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور تعامل اور پھر اتفاق صحابہؓ اس پر شاہد ہیں اور خود ذبح کرنا افضل ہے اگر خود ذبح کرنا نہیں جانتا تو دوسرے سے ذبح کرا سکتا ہے۔ مگر ذبح کے وقت وہاں خود بھی حاضر رہنا افضل ہے۔

مسئلہ: قربانی کی نیت صرف دل سے کرنا کافی ہے زبان سے کہنا ضروری نہیں، البتہ ذبح کرنے کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہنا ضروری ہے اور سنت ہے کہ جب جانور ذبح کرنے کیلئے روبقبلہ لٹائے تو یہ دعا پڑھے:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ٥ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥ اور ذبح کرنے کے بعد یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْهُ مِنِّیْ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِیْبِكَ مُحَمَّدٍ وَّخَلِیْلِكَ اِبْرَاهِیْمَ عَلَیْهِمَا السَّلَامُ۔

آدابِ قربانی:

قربانی کے جانور کو چند روز پہلے سے پالنا افضل ہے۔

مسئلہ: قربانی کے جانور کا دودھ نکالنا یا اس کے بال کاٹنا جائز نہیں، اگر کسی نے ایسا کرلیا تو دودھ اور بال یا ان کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ (بدائع)

مسئلہ: قربانی سے پہلے چھری کو خوب تیز کرلے اور ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح نہ کرے اور ذبح کرنے کے بعد کھال اتارنے اور گوشت کے ٹکڑے کرنے میں جلدی نہ کرے جب تک پوری طرح جانور ٹھنڈا نہ ہوجائے۔ (بدائع)

قربانی کے گوشت کے احکام:

مسئلہ:- قربانی کرنے والے کو اپنی قربانی کے گوشت کے متعلق اختیار رہے چاہے سارا گوشت اپنے گھر رکھ لے یا سارا گوشت خیرات کردے یا سارا دوستوں اور عزیزوں میں تقسیم کردے، افضل یہ ہے کہ سارے گوشت کے تین حصے کرلے ایک تہائی حصہ خود رکھ لے اور ایک تہائی حصہ اپنے رشتہ داروں کو ہدیۃً پہنچادے اور ایک تہائی حصہ فقیروں اور محتاجوں کو دیدے، خیرات کرنے میں ایک تہائی سے کم نہ کریں تو بہت اچھا ہے۔ (درمختار)

مسئلہ: اگر ایک گائے یا بیل یا بھینس یا اونٹ میں سات آدمی ملکر شریک ہوئے اور قربانی کی تو اب اس کا گوشت باہم اندازہ سے تقسیم نہ کریں، بلکہ خوب ٹھیک ٹھیک وزن کرکے بانٹیں اگر کسی کے حصے میں گوشت کم ہوگیا تو سُود ہوجائے گا اور سُود لینے والے اور دینے والے چاہے رضامندی سے یہ لین دین کریں سخت گناہ گار ہوتے ہیں اور جس کے حصہ میں گوشت زیادہ چلاگیا اس کو بھی اس کا کھانا جائز نہیں، بہرحال سارے شرکاء اگرچہ خوشدلی سے ہر ایک شریک کو اجازت دیدیں کہ جو شریک جتنا چاہے گوشت لیجائے تب بھی کسی شریک کو اس طرح لینا جائز نہیں۔ البتہ اگر گوشت کی تقسیم میں سری پائے، کلیے اور کھال کو بھی شامل کرلیا جائے اور مثلاً اس طرح تقسیم کیا جائے کہ چار حصوں میں ایک ایک پایا رکھ دیا جائے اور باقی تین حصوں میں سے ایک میں کھال ایک میں سری مع مغز اور ایک میں زبان اور کلیے رکھ دیئے جائیں تو پھر وزن کرکے گوشت تقسیم کرنا ضروری نہیں اندازہ سے گوشت کے سات حصے کرکے مذکورہ چیزوں میں رکھ دیئے جائیں تو بغیر تولے بھی محض اندازہ سے گوشت تقسیم کرلینا جائز ہے۔ (عالمگیری)

مسئلہ:- اگر ایک جانور میں کئی شریک ہیں اور وہ سب گوشت آپس میں تقسیم نہیں کرتے بلکہ اجتماعی طور پر ہی فقراء اور احباب میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو بھی تقسیم ضروری نہیں ہے ہاں شرکاء آپس میں تقسیم کریں گے تو اس میں وزن کے لحاظ سے برابری ضروری ہے یا وہ صورت اختیار کی جائے جو اوپر کے مسئلہ میں ذکر ہوئی۔ (شامی بتصرف)

مسئلہ: قربانی کا گوشت فروخت کرنا حرام ہے اسی طرح قصائی کو ذبح کرنے کی اُجرت میں گوشت دینا بھی جائز نہیں اُجرت علیحدہ سے دینی چاہیئے۔ (احکام عیدالاضحیٰ و قربانی)

مسئلہ: اگر کسی نے غلطی سے یا جان بوجھ کر قربانی کا گوشت فروخت کردیا تو اتنے گوشت کی قیمت صدقہ کرے اور پھر صدق دل سے توبہ کرے اور آئندہ احتیاط کرے۔ (عالمگیری بتصرف)

مسئلہ: قربانی کا گوشت غیر مسلم جیسے عیسائی، یہودی، مجوسی اور ہندو وغیرہ کو دینا جائز ہے۔ (عالمگیری)

مسئلہ: قربانی کے جانور کی چربی، چھچھڑے قصائی کو مزدوری میں دینا جائز نہیں، مزدوری اپنے پاس سے الگ دے۔ (درمختار)

قربانی کے کھال کے احکام:

قربانی کی کھال فروخت نہ کی جائے تو شریعت نے قربانی کرنے والے کو اس میں کئی طرح کا اختیار دیا ہے لیکن فروخت کرنے سے اکثر صورتوں میں قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہوجاتا ہے، بعض صورتوں میں واجب نہیں ہوتا یہاں ان سب مسائل کی ضروری تفصیل بیان کی جاتی ہے (یہ آنیوالے تمام مسائل حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ کے مرتب کردہ "مسائل چرم قربانی" سے ماخوذ ہیں)۔

مسئلہ: قربانی کی کھال اپنے اور اہل وعیال کے استعمال میں لانا جائز ہے مثلاً جائے نماز، کتابوں کی جلد، مشکیزہ، ڈول، دسترخوان، جراب، جوتہ وغیرہ کوئی بھی چیز بنا کر استعمال کی جاسکتی ہے بلا کراہت جائز ہے۔ (ہدایہ و درمختار)

لیکن ان چیزوں کو کرایہ پر دینا جائز نہیں، اگر دیدیں تو جو کرایہ ملے اُس کا صدقہ واجب ہے۔ (شامی و عالمگیری)

مسئلہ: یہ بھی جائز ہے کہ کھال یا اُس سے بنائی ہوئی چیز کسی کو ہبہ میں (بلا معاوضہ) دیدی جائے جس کو دی جائے خواہ وہ سید اور مالدار ہو یا اپنے ماں باپ، اور اہل وعیال ہوں اجنبی ہو یا رشتہ دار، کافر ہو یا مسلمان بلا معاوضہ ہر ایک کو دینا جائز ہے۔ (ہدایہ عالمگیری، امداد الفتاوی)

مسئلہ: فقراء و مساکین کو خیرات میں بھی دی جاسکتی ہے مگر یہ مستحب ہے واجب نہیں۔ (بحر و عالمگیری)

مسئلہ: قربانی کی کھال، گوشت، چربی، اُون، آنتیں وغیرہ یعنی قربانی کے جانور کا کوئی جزء کسی خدمت کے معاوضہ میں دینا جائز نہیں، اگر دیدیا تو اس کی قیمت کا صدقہ واجب ہے۔

(ہدایہ، عالمگیری، امداد الفتاوی)

مسئلہ قربانی کے جانور کی جھول، رسی اور ہار جو گلے میں پڑا ہو، وہ بھی کسی کی خدمت کے معاوضے میں دینا جائز نہیں۔ ان چیزوں کو خیرات کردینا مستحب ہے۔ (شامی، عالمگیری، ہدایہ وعزیز الفتاویٰ)

قربانی کی کوئی چیز قصائی وغیرہ کو بھی اس کی مزدوری میں دینا جائز نہیں، اس کی مزدوری الگ دینی چاہیئے۔ (ہدایہ درمختار)

امام ومؤذن کو بھی حق الخدمت کے طور پر دینا جائز نہیں، حق الخدمت اور معاوضے کے بغیر ہر ایک کو دے سکتے ہیں، ان کو بھی دے سکتے ہیں۔

کھال کی قیمت کے احکام:

قربانی کی کھال یا اُس سے بنائی ہوئی چیز کو فروخت کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ روپے کے بدلے فروخت کی تو اس رقم کا صدقہ کرنا واجب ہے اسی طرح اگر ایسی کسی اور چیز کے بدلے میں فروخت کی جو باقی رہتے ہوئے استعمال میں نہیں آتی، یعنی اسے خرچ کئے بغیر اُس سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاسکتا، مثلاً کھانے پینے کی چیزیں اور تیل، پٹرول، رنگ وروغن وغیرہ تو ان اشیاء کا بھی صدقہ واجب ہے، یہ فقراء ومساکین کا حق ہے کسی اور مصرف میں لانا جائز نہیں۔

(ہدایہ، بدائع، وامداد الفتاویٰ)

ان اشیاء کے بدلے قربانی کی کھال اس نیت سے فروخت کرنا کہ اپنے خرچ میں لے آئینگے، مکروہ بھی ہے صدقہ کرنے کی نیت سے فروخت کرنے میں مضائقہ نہیں، لیکن کسی بھی نیت سے فروخت کی ہو بیع نافذ ہوجائے گی اور ان اشیاء کا صدقہ بہرحال واجب ہوگا۔ (بحر، درمختار، عالمگیری)

اور اگر قربانی کی کھال یا اس سے بنائی ہوئی چیز کسی ایسی چیز کے بدلے میں فروخت کی جو باقی رہتے ہوئے استعمال میں آتی ہے یعنی اسے خرچ کئے بغیر اُس سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے مثلاً کپڑے، برتن، میز، کرسی، کتاب، قلم وغیرہ تو ان اشیاء کا صدقہ واجب نہیں، بلکہ ان کا وہی حکم ہے جو پیچھے کھال کا بیان ہوا، کہ خود اپنے کام میں لانا دوسرے کو ہبہ میں (بلامعاوضہ) دیدینا اور خیرات کرنا سب جائز ہے۔

(ہدایہ، بدائع، درمختار، امداد الفتاویٰ)

پھر اگر ان اشیاء کو روپے یا کھانے پینے اور خرچ ہوتے والی اشیاء کے بدلے فروخت کردیا تو حاصل ہونے والی قیمت کا صدقہ واجب ہوگا۔ (امداد الفتاویٰ، جلد ۳، ص ۵۰۳)

قربانی کی کھال وغیرہ کی قیمت کا مصرف:

مسئلہ: اوپر اور آگے جن جن مسائل میں صدقہ کا واجب ہونا بیان کیا گیا ہے وہ صدقہ صرف ان ہی فقراء و مساکین کو دیا جاسکتا ہے جنہیں زکوٰۃ دینا درست ہے جن لوگوں کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔ انہیں یہ صدقہ بھی نہیں دیا جاسکتا تفصیل آگے مسائل میں آرہی ہے۔

(امداد الفتاوٰی ص ۳۳۶، ۵۶۶، جلد ۳)

مسئلہ: جس کی ملکیت میں اتنا مال ہو کہ جس سے زکوٰۃ یا قربانی واجب ہوجاتی ہے وہ شرعاً مالدار ہے اسے یہ صدقہ دینا جائز نہیں اور جس کے پاس اس سے کم مال ہو وہ شرعاً غریب اور مستحق زکوٰۃ ہے۔ اسے یہ صدقہ بھی دیا جاسکتا ہے۔ (درمختار ص ۹۹ - جلد ۲ و بحر ص ۲۶۳ جلد ۲)

نابالغ بچوں کا باپ اگر مالدار ہو تو ان کو بھی نہیں دے سکتے، لیکن اگر اولاد بالغ ہو اور مالدار نہ ہو تو اُن کو دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مالدار کی بیوی اگر مالدار نہ ہو تو اسے بھی دے سکتے ہیں (ہدایہ)

اگر نابالغ بچوں کی ماں تو مالدار ہے باپ مالدار نہیں تو ان بچوں کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ (درمختار)

مسئلہ: سید اور بنو ہاشم کو (یعنی جو لوگ حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ، حضرت جعفرؓ، حضرت عقیل، یا حضرت حارث بن عبدالمطلب کی اولاد میں ہوں ان کو) یہ صدقہ دینا جائز نہیں۔

(شامی، بحر، ہدایہ، امداد الفتاوٰی)

مسئلہ: اپنے ماں باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، پردادا وغیرہ کو کہ جن کی اولاد میں یہ خود ہے یہ صدقہ دینا درست نہیں۔ (ہدایہ جلد ۱)

اسی طرح اولاد، پوتے، پوتی، نواسے نواسی وغیرہ کہ جو اس کی اولاد میں داخل ہیں ان کو دینے سے بھی یہ صدقہ ادا نہ ہوگا۔ شوہر اور بیوی بھی ایک دوسرے کو نہیں دے سکتے۔ (ہدایہ جلد ۱)

باقی سب رشتہ داروں کو دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ مستحق زکوٰۃ ہوں۔ بلکہ ان کو دینے میں دوگنا ثواب ہے ایک خیرات کا اور دوسرا اپنے عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک کا۔ (شامی جلد ۲)

مسئلہ: فتویٰ اس پر ہے کہ یہ صدقہ کافر کو نہ دیا جائے۔ (شامی ص ۹۲، درمختار ص ۱۰۸، جلد ۲، امداد المفتین ص ۴۴۴)

مسئلہ: کسی کو مزدوری، یا حق الخدمت کے طور پر یہ صدقہ بھی نہیں دیا جاسکتا۔

مسئلہ: زکوٰۃ اور دوسرے صدقات واجبہ کی طرح اس صدقہ کی ادائیگی کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ یہ کسی فقیر مسکین کو مالکانہ طور پر دیدیا جائے، جس میں اس کو ہر طرح کا اختیار ہو، اس کے مالکانہ قبضے کے بغیر یہ صدقہ بھی ادا نہ ہوگا۔ (در مختار ص ۱۸، جلد ۴ و امداد الفتاویٰ)

چنانچہ اسے مسجد، مدرسہ، شفاخانہ، کنویں، پُل یا کسی اور رفاہی ادارے کی تعمیر میں خرچ کرنا جائز نہیں، اسی طرح کسی لاوارث کے کفن یا میت کی طرف سے قرض ادا کرنے میں بھی اسے خرچ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہاں کسی فقیر کو مالک بنانا اور اس کے قبضے میں دینا نہیں پایا گیا۔ (کنز، ہدایہ، بحر)

کسی ایسے مدرسے یا انجمن وغیرہ میں دینا بھی کہ جہاں وہ غریبوں کو مالکانہ طور پر نہ دیا جاتا ہو، بلکہ ملازمین کی تنخواہوں یا تعمیر اور فرنیچر وغیرہ انتظامی مصارف میں خرچ کر دیا جاتا ہو جائز نہیں۔ البتہ اگر کسی ادارے میں غریب طلبہ یا دوسرے مسکینوں کو کھانا وغیرہ مُفت دیا جاتا ہو وہاں یہ صدقہ دینا جائز ہے لیکن یہ اس وقت ادا ہوگا جب وہ رقم بعینہٖ یا اس سے خریدی ہوئی اشیاء، مثلاً کھانا، کتابیں، کپڑے، دوا وغیرہ ان غریبوں کو مالکانہ طور پر مُفت دیدی جائیں۔ (امداد الفتاویٰ)

چرم قربانی کی قیمت مسجد اور مدرسے میں خرچ کرنے کی ترکیب:

البتہ اگر کھال کسی غریب یا مالدار کو یا کھال کی رقم کسی غریب کو مالکانہ طور پر قبضہ میں دیدی، اور صراحت کر دی کہ تم اس کے پوری طرح مالک ہو، ہمیں اس میں کوئی اختیار نہیں۔ پھر وہ اپنی خوشی سے اس کی رقم مسجد، مدرسہ یا کسی بھی رفاہی ادارے کی تعمیر، یا اس کے ملازمین کے تنخواہوں وغیرہ میں اپنی طرف سے لگادے تو یہ جائز ہے مگر یاد رہے کہ "حیلہ تملیک" کے نام سے جو کھیل عام طور سے کھیلا جاتا ہے اس سے زکوٰۃ کی طرح یہ صدقہ بھی ادا نہیں ہوتا کیونکہ عموماً جس کو دیا جاتا ہے وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ مجھے اس مال کا کوئی اختیار نہیں اگر اپنے پاس رکھ لوں گا تو لوگ ملامت کریں گے، اس خوف اور شرم سے بیچارہ یہ رقم چندہ میں دیدیتا ہے۔ یہ محض زبانی جمع خرچ ہے، اس طرح نہ وہ مالک ہوتا ہے، نہ دینے والے کا صدقہ ادا ہوتا ہے، اس حیلے سے یہ رقم مسجد یا مدرسہ وغیرہ کی تعمیر و انتظامی ضروریات میں خرچ کرنا جائز نہیں۔

(امداد الفتاویٰ ص ۵۳۴ جلد ۳)

متفرق مسائل:

مسئلہ: بعض لوگ جانور کی کھال اس طرح اتارتے ہیں کہ اس میں چھری لگ کر سوراخ ہو جاتے ہیں یا

کھال پر گوشت لگا رہ جاتا ہے۔ جس سے کھال کو نقصان پہنچتا ہے بعض لوگ کھال اُتارنے کے بعد اُس کی حفاظت نہیں کرتے، سڑ کر بیکار یا بہت کم قیمت کی رہ جاتی ہے۔ یہ سب امور اسراف اور تبذیر (فضول خرچی) میں داخل ہیں، جس کی ممانعت قرآن کریم میں آئی ہے۔ اس لئے کھال احتیاط سے اُتار کر ضائع ہونے سے بچانا شرعاً ضروری ہے۔

مسئلہ: جس نے قربانی کی کھال خریدی، وُہ اس کا مالک ہوگیا اس پر ہر قسم کا تصرّف کرسکتا ہے، خواہ اپنے پاس رکھے یا فروخت کرکے قیمت اپنے خرچ میں لائے۔ (امداد الفتاویٰ)

مسئلہ: قربانی کی گائے میں جو لوگ شریک ہوں، وہ کھال میں بھی اپنے اپنے حصّے کے برابر شریک ہوں گے کسی ایک شریک کو یہ کھال باقی شرکاء سے اجازت کے بغیر اپنے پاس رکھ لینا یا کسی کو دیدینا جائز نہیں۔

مسئلہ: اگر ایک شریک باقی شرکاء سے اُن کے حصّے جو کھال میں ہیں خرید لے تو اَب پوری کھال اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔ پھر اگر یہ شخص اس کھال کو روپے یا کھانے پینے کی اشیاء کے بدلے فروخت کریگا تو قیمت کا ساتواں حصّہ جو اس کا اپنا تھا اس کا تو صدقہ واجب ہوگا اور باقی چھ حصّے جو شرکاء سے خریدے تھے۔ اُن کی قیمت کا صدقہ اس پر واجب نہیں اُسے اپنے خرچ میں لانا درست ہے۔ (امداد الفتاویٰ جلد ۳ ص ۵۷۵)

مسئلہ: مذکورہ بالا سب مسائل میں جو احکام کھال کے ہیں وہی جانور ذبح کرنے کے بعد اس کی اُون اور بالوں کے ہیں اور اگر اُون اور بال فروخت کردیئے تو جو تفصیل کھال کی قیمت کے متعلق بیان کی گئی، وہی ان کی قیمت میں بھی ہوگی۔ مگر یاد رہے کہ قربانی کا جانور ذبح کرنے سے پہلے اس کی اُون اور بال کاٹنا جائز نہیں، اگر کاٹ لئے تو ان کا یا ان کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں۔

(ہدایہ، عالمگیری، بحر، شامی) واللہ اعلم

• صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا مولانا محمد وآلہ واصحابہ وبارک وسلم۔
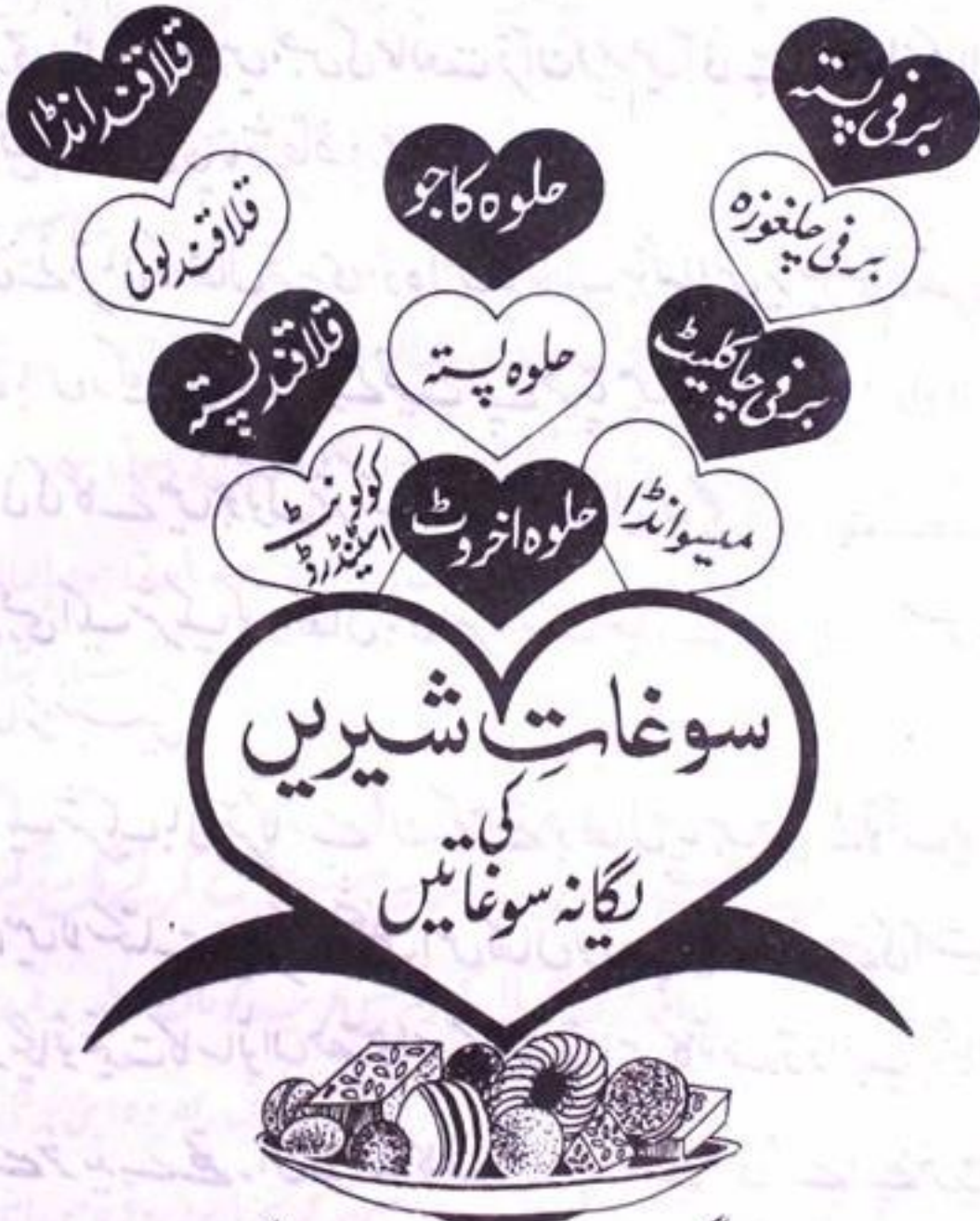
ترتیب: صباء دانش
درسگاہ دینیات جیل روڈ حیدر آباد سندھ

سلام کرنے کے احکام و آداب

حسبِ ذیل اُمور و حالات میں مشغول شخص کو سلام کرنا مکروہ ہے، اور کوئی شخص ایسی حالت میں اس کو سلام کرے تو ایسے شخص پر اس کا جواب دینا واجب نہیں۔

(۱) حالتِ نماز میں
(۲) حالتِ ذکر میں
(۳) حالتِ خطبہ میں
(۴) حالتِ درس و تدریس میں
(۵) حالتِ تلاوت میں
(۶) حالتِ اذان میں
(۷) حالتِ اقامت میں
(۸) حالتِ دُعاء میں
(۹) حالتِ تسبیح میں
(۱۰) مسائلِ شرعیہ کے مذاکرہ اور تحقیق کے دوران
(۱۱) فیصلے کے دوران (قاضی کو)
(۱۲) کسی کے کھانے پینے کے دوران
(۱۳) اجنبی عورت کو
(۱۴) برہنہ شخص کو
(۱۵) تلبیہ (لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ) پڑھنے کی حالت میں
(۱۶) حالتِ امامت میں
(۱۷) قضاحاجت کے دوران
(۱۸) حمام میں
(۱۹) حالتِ وعظ میں
(۲۰) مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھنے والوں کو

نیز درج ذیل لوگوں کو بھی سلام کرنا مکروہ ہے، اور اگر یہ لوگ کسی کو سلام کریں تو ان کے سلام کا جواب دینا واجب نہیں۔

(۱) علی الاعلان فسق و فجور میں مبتلا شخص
(۲) بھیک مانگنے والا
(۳) غیبت کا عادی
(۴) سونے والا
(۵) شطرنج اور جوا کھیلنے والا
(۶) گانے بجانے والا
(۷) کبوتر باز
(۸) پاگل
(۹) اونگھنے والا
(۱۰) گالی بکنے والا
(۱۱) بات بات پر جھوٹ بولنے والا
(۱۲) شرابی
(۱۳) زندیق
(۱۴) کافر

(از رد المحتار علی الدر المختار (شامی) ج ۱ ص ۴۱۴ و ص ۴۱۵)

تعارف وتبصرہ

قرآن مجید مع ترجمہ وتفسیر بزبان بلوچی

مترجم ومفسر: علامہ قاضی عبدالصمد سربازیؒ ومولانا خیر محمد ندوی

ناشران: الجمعیۃ المرکزیۃ للدعوۃ الاسلامیۃ، پنجگور، مکران
وجمعیۃ انصار السنۃ المحمدیۃ، تربت، مکران

سائز: ۲۳×۳۶/۸ ، صفحات: ۳۰۸

ہدیہ: ۱۲۰ روپے

یہ بلوچی زبان میں قرآن مجید کا دستیاب سب سے پہلا ترجمہ وتفسیر ہے، جس کی جلد اول اس وقت پیش نظر ہے، جو شروع کے دس پاروں پر مشتمل ہے، ترجمۂ قرآن پاک شروع سے انیسویں پارے تک سابق ممبر شوریٰ وقاضی القضاۃ ریاست قلات جناب مولانا قاضی عبدالصمد سربازی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ کیا ہوا ہے، اور آخر کے گیارہ پارے مولانا خیر محمد ندوی،، مدیر ماہنامہ سوغات بلوچی،، کے ترجمہ کردہ ہیں، دونوں اہل علم حضرات کے نزدیک محتاج تعارف نہیں ہیں، اور تفسیر بتمامہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی،، تفسیر عثمانی،، کا ترجمہ ہے، جو انہیں دو حضرات کے علمی کاوش سے بلوچی کے قالب میں ڈھالا گیا ہے، زبان آسان اور دلنشین ہے۔

بعض حلقوں میں بلوچ مسلمانوں کے ذہنوں کو اسلامی روایات سے دور کرنے کے لئے دو مذموم سازشیں ہو رہی ہیں۔ ایک یہ کہ بلوچی رسم الخط لاطینی حروف میں ہونا چاہیئے، دوسری یہ کہ رسم الخط ہو تو عربی میں، لیکن جتنے عربی کلمات بلوچی میں مستعمل ہیں ان کے حروف کو تحریف کیا جائے جیسے،، خالق،، کو،، ہالک،،،، حق،، کو،، ہک،،، فاضل، کو، پازل، وغیرہ، تاکہ اس طریقے سے بلوچی دان طبقے کے لئے قرآن مجید اور احادیث شریفہ کے سمجھنے میں زیادہ دشواریاں پیش آئیں۔

لیکن الحمدللہ اس ترجمہ وتفسیر میں ایسی حرکات سے بالکل گریز کیا گیا ہے اور عربی کے جو کلمات ہیں ان کو اپنی اصل صورت میں لکھا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ مترجم، مفسر اور ناشران کو دارین کی سعادتیں عطا فرمائے، آمین، شروع کے چند صفحات میں پیش لفظ اور مترجمین کے احوال زندگی اور دیگر معلومات کے لئے وقف کئے گئے ہیں جو اپنی جگہ پر انتہائی مفید معلومات پر مشتمل ہیں۔

یہ ترجمہ و تفسیر اعلیٰ کاغذ پر آفسٹ طباعت اور رنگین کی خوبصورت ڈائی دار جلد کے ساتھ پیش کی جارہی ہے، جو انتہائی بہترین ہے۔" البتہ موجودہ قیمت زیادہ ہے اگر کم کردی جائے تو بہتر ہے"

ہم بلوچی دان طبقے، نیز علمی عمومی لائبریریوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی سفارش کرتے ہیں۔

فقط محمد عرب ربانی

۱۴۰۶/۶/۵ھ